

فَمَا كَرِهَتْكُمْ وَسُكْرُ الْكَافَّةِ الرَّاشِدِينَ الْمُهْدِيَةِ

ماہنامہ
جہلم

شمارہ نمبر
18

ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل ۲۰۱۰ء

السنة



غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

• مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا

لٹکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

• رقص کی شرعی حیثیت

• صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکار حدیث

• وفات النبی ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

www.ircpk.com

دارالتخصص والتحقیق، جہلم، پاکستان



اہل سنت کون؟ حافظ ابوبکیٰ نورپوری

امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے اور اسی کو اپنا عقیدہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”۔۔۔ اور میں ایمان رکھتا ہوں کہ جنت اور جہنم دونوں مخلوق ہیں، دونوں آج موجود ہیں اور وہ کبھی فنا نہ ہوں گی۔ مومن روز قیامت اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جیسا کہ وہ چودہویں رات چاند کو دیکھ لیتے ہیں، اس کے دیکھنے میں کوئی تنگی محسوس نہیں کریں گے۔ میں یہ بھی ایمان رکھتا ہوں کہ محمد ﷺ خاتم النبیین والمرسلین ہیں۔ کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک وہ آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں لے آتا اور آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی نہیں دے دیتا۔ (میرا یہ بھی اعتقاد ہے کہ) آپ ﷺ کی امت میں سے افضل ترین شخصیت سیدنا ابوبکر صدیق ہیں، پھر سیدنا عمر فاروق، پھر سیدنا عثمان ذوالنورین، پھر سیدنا علی المرتضیٰ، پھر عشرہ مبشرہ میں سے (خلفائے اربعہ کے علاوہ) باقی صحابہ، پھر بدر والے، پھر درخت کے نیچے بیعت رضوان کرنے والے، پھر باقی تمام صحابہ کرام ہیں۔ ﷺ

میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سے محبت رکھتا ہوں، ان کے محاسن بیان کرتا ہوں، ان سے راضی ہوں، ان کے لیے استغفار کرتا ہوں، ان کی غلطیوں کو بیان کرنے سے اپنی زبان کو روکتا ہوں، ان کے درمیان ہونے والے اختلافات (میں تبصرہ کرنے) سے خاموش رہتا ہوں اور اس فرمان باری تعالیٰ کی تعمیل کرتے ہوئے ان کی فضیلت پر پورا یقین رکھتا ہوں:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (الحشر: ۱۰/۵۹) (اور وہ لوگ) (بھی مالِ فے کے حق دار ہیں) جو کہتے ہیں، اے ہمارے رب! ہمیں معاف کر دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی، جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گزر چکے ہیں، تو ہمارے دلوں میں ایمان والے لوگوں کے خلاف کینہ پیدا نہ کرنا، اے ہمارے رب! یقیناً تو رؤوف و رحیم ہے۔)

میں امہات المؤمنین پر راضی ہوں، جو کہ ہر بُرائی سے پاک ہیں۔ میں اولیائے کرام کی کرامات و کمالات کا بھی اتراری ہوں، مگر وہ اللہ تعالیٰ کے حق (عبادت) میں سے کسی چیز کے مستحق نہیں ہو سکتے، نہ ہی ان سے وہ چیزیں طلب کی جاسکتی ہیں، جن پر صرف اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ میں کسی مسلمان کے لیے جنت و جہنم کا حکم نہیں لگاتا، سوائے ان لوگوں کے جن پر رسول اللہ ﷺ نے (جنت یا جہنم کا) حکم لگا دیا ہے، البتہ میں نیک و کار کے لیے (جنت کی) امید رکھتا ہوں اور بدکار پر (جہنم واجب ہونے کا) ڈر رکھتا ہوں۔ میں کسی گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دیتا اور نہ دائرۃ اسلام سے کسی مسلمان کو خارج قرار دیتا ہوں۔ میں ہر نیک و فاجر خلیفہ کے ساتھ مل کر جہاد کرنا درست سمجھتا ہوں۔ ان (فاجر خلیفوں) کی اقتداء میں نماز جائز ہے۔۔۔“ (مؤلفات ابن عبد الوہاب: ص ۱۰-۱۱)

جاری ہے۔۔۔

شماره نمبر ۱۸ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل ۲۰۱۰ء

① مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا

2 غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری لٹکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

18 غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری ③ رقص کی شرعی حیثیت

29 حافظ ابو یحییٰ نور پوری ④ صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکار حدیث

⑤ الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ...

کے محل نزول و روز نزول کے متعلق حدیث

36 غزوہ بدر کے متعلق حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ⑥

40 سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ ⑥

48 وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ⑥

علامہ مصطفیٰ ظہیر امن پوری

مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا
لٹکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے تہہ بند، شلوار، پاجامہ، قمیص وغیرہ لٹکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا تکبر اور اسراف ہے۔ یہ عمل شنیع متکبرین اور عورتوں سے مشابہت وغیرہ کا موجب ہے، جبکہ اس سے اجتناب واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَمْسُ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ (بنی اسرائیل: ۳۷/۱۷)

”اور زمین پر اکڑ کر مت چلو، نہ تو آپ زمین کو پھاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (لقمان: ۱۸/۳۱)
”اللہ تعالیٰ متکبر اور شنیع خورے کو پسند نہیں فرماتے۔“

ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانے والے کے بارے میں شدید وعید آئی ہے، جیسا کہ:
① سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بينا رجل يجرّ إزاره ، خسف به ، فهو يتجلجل في الأرض إلى يوم القيامة))
” (تم سے پہلے لوگوں میں) ایک آدمی تھا، جو تکبر اور غرور کی وجہ سے اپنا تہہ بند گھسیٹ کر چلتا تھا (جان بوجھ کر اس نے کپڑا لٹکایا ہوا تھا)، وہ اس وجہ سے زمین میں دھنسا دیا گیا، تا قیامت زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔“ (صحیح بخاری: ۵۷۹۰، صحیح مسلم: ۴۹/۲۰۸۸ من حدیث ابی ہریرۃ)

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ما أسفل من الكعبين من الإزار في النار))
”ٹخنوں کے نیچے جسم کا وہ حصہ جہاں تہہ بند پہنچے، وہ آگ میں جلے گا۔“ (صحیح بخاری: ۵۷۸۷)

③ سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تین شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت ان سے کلام نہیں کریں گے، نہ ان کی طرف نظر

رحمت سے دیکھیں گے، نہ ہی ان کو گناہوں سے پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین بار فرمائی، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا، اے اللہ کے رسول! وہ خاسر و خائب لوگ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((المسبل إزاره، والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب)) ”① ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا ② و المنفق سلعته بالحلف الكاذب))

احسان جتلانے والا اور ③ جھوٹی قسم اٹھا کر مال فروخت کرنے والا۔“ (صحیح مسلم: ۱۰۶)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ :

وہ احادیث جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر نہیں ہے، ان کے عموم کو ان احادیث کے ساتھ خاص کر دیا جائے، جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر ہے، یعنی وعید اس شخص کے لیے ہوگی، جو تکبر کی وجہ سے کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔“

(التمهيد لابن عبد البر: ۲۴۴/۳، شرح صحيح مسلم للنووي: ۷۱/۱، ۱۹۴/۲-۱۹۵)

علامہ ابن العربی المالکی رحمہ اللہ اس شبہ کا ازالہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

لا يجوز لرجل أن يجاوز بثوبه كعبه ويقول: لا أتكبر فيه، لأنّ النهي قد تناوله لفظا وتناول علته، ولا يجوز يتناول اللفظ حكما، فيقال: إنّي لست ممّن يمثله، لأنّ تلك العلة ليست فيّ، فإنّه مخالفة للشريعة، ودعوى لا تسلم له، بل من تكبره يطيل ثوبه وإزاره، فكذبه معلوم... ”کسی آدمی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے اور کہے کہ میرا اس میں تکبر کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ کہنا اس لیے جائز نہیں ہے کہ اس پر (کپڑا لٹکانے کی) نہی لفظی اعتبار سے شامل ہے اور یہ نہی کی علت، یعنی تکبر کو بھی شامل ہے۔ جب ایک لفظ حکم پر بھی شامل ہو تو آدمی کے لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ میں اس کا ارتکاب نہیں کرتا، کیونکہ یہ (تکبر والی) علت مجھ میں نہیں پائی جاتی۔ یہ شریعت کی مخالفت ہے اور ایسا دعویٰ ہے، جسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ اپنے تکبر ہی کی وجہ سے اپنے کپڑے اور تہ بند کو لمبا رکھتا ہے، لہذا اس کا جھوٹ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔“ (عارضۃ الاحوذی لابن العربی: ۲۳۸/۷)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس عبارت کا حاصل ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: الإسبال يستلزم جرّ الثوب وجرّ الثوب يستلزم الخيلاء، ولو لم يقصد اللابس الخيلاء....

”کپڑا لٹکانے سے گھسٹنا لازم آتا ہے اور گھسٹنے سے تکبر لازم آتا ہے، اگرچہ پہننے والا تکبر کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو۔“ (فتح الباری لابن حجر : ۲۶۴/۱۰)

⑤ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ سیدنا جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وارفِعْ إِزَارَكَ إِلَى نِصْفِ السَّاقِ ، فَإِنَّ أُبَيْتَ فَالِي

الْكَعْبَيْنِ ، وَإِيَّاكَ وَإِسْبَالَ الْإِزَارِ ، فَإِنَّهَا مِنَ الْمَخِيلَةِ ، وَإِنَّ اللَّهَ لَا يَحِبُّ الْمَخِيلَةَ ..))
 ”اپنا بند نصف پنڈلی تک اٹھا کر رکھو، اگر تم اس سے انکاری ہو تو (کم از کم) دونوں ٹخنوں تک رکھو، تب بند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے بچو، یہ تکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔“
 (سنن ابی داؤد، ۴۰۸۴، واللفظ له، المعجم الكبير للطبرانی : ۶۳۸۶، السنن الكبرى للبيهقي

: ۲۳۶/۱۰، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ (۲۷۲۲) نے ”حسن صحیح“ اور امام حاکم رحمہ اللہ (۱۸۶/۴) نے ”صحیح“ کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں: ((وَإِيَّاكَ وَتَسْبِلُ الْإِزَارَ ، فَإِنَّهَا مِنَ الْخِيَلَاءِ ، وَالْخِيَلَاءُ لَا يَحِبُّهَا اللَّهُ))
 ”ٹخنوں سے نیچے تب بند لٹکانے سے بچو، کیونکہ یہ تکبر ہے اور تکبر

کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے۔“ (مسند الامام احمد : ۶۳/۵، وصححه ابن حبان (۵۲۲) وقال ابن عساکر: حديث حسن غريب (معجم الشيوخ لابن عساکر : ۱۴۹۱)، وسنده صحيح)

اس حدیث میں تخصیص و تصریح ہے کہ جان بوجھ کر کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹکانا ہی تکبر اور عُجْب و افتخار کی علامت ہے، خواہ تکبر کا قصد نہ بھی ہو۔

⑤ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرا گزر نبی اکرم ﷺ کے پاس سے ہوا۔ میری حالت یہ تھی کہ (غیر ارادی طور پر) میری شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اے عبد اللہ! اپنی شلوار اوپر کر، میں نے اوپر کر لی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اور زیادہ کر، میں نے اور زیادہ کر لی۔ اس کے بعد میں ہمیشہ خیال رکھتا تھا (کہ کہیں شلوار ٹخنے سے نیچے نہ چلی جائے)۔ لوگوں نے پوچھا، شلوار کہاں تک ہونی چاہیے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا، نصف پنڈلی تک۔“ (صحیح مسلم : ۲۰۸۶)

⑥ ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھ کر فرمایا:

((من هذا؟ فقلت: أنا عبد الله! فقال: إن كنت عبد الله، فارفع إزارك))
 ”یہ کون ہے؟ میں نے عرض کی، میں عبد اللہ ہوں، آپ نے فرمایا، اگر تو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) ہے تو اپنا تہبند ٹخنوں سے اوپر کر لے۔“ (مسند الامام احمد: ۱۴۷/۲، مسند ابی یعلیٰ: ۵۶۴۴، شعب الایمان للبیہقی: ۶۱۱۹، وسندہ صحیح)

غور فرمائیں کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان کی نیت کے بارے میں سوال نہیں کیا کہ کیا آپ نے کپڑا تکبر کی وجہ سے لٹکایا ہے یا ویسے ہی؟ بلکہ جوں ہی دیکھا، کپڑے کو اوپر اٹھانے کا حکم صادر فرمادیا، لہذا یہ کہنا کی تکبر کی نیت ہو تو ناجائز ہے، ورنہ نہیں۔ کیا سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حسن ظن یہ ہے کہ انہوں نے تکبر کی بنا پر لٹکایا تھا، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا؟ اصل بات یہ ہے کہ تکبر کی قید اس لیے لگائی گئی کہ بسا اوقات نہ سمجھی میں یا خود بخود تہبند نیچے ہو جاتا ہے، اس پر یہ وعید نہیں، لیکن جو جانتے بوجھتے اس طرح کرے گا، وہ متکبر ہوگا۔

⑥ سیدنا شرید بن سوید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک ثقفی شخص کے پیچھے چل رہے تھے، یہاں تک کہ اس کی طرف لپک (عام چال اور دوڑنے کے درمیان کی چال چل) کر اس کا کپڑا پکڑ لیا اور فرمایا: ارفع إزارک (فی رواية الحمیدی: ۸۱۰، واحمد: ۱۹۴۰۴، وسندہ صحیح: واثق اللہ) ”اپنا تہبند ٹخنوں سے اوپر کر لیں اور اللہ سے ڈرجائیں۔“

راوی کہتے ہیں کہ اس آدمی نے اپنے ٹخنوں سے کپڑا اٹھا لیا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! میرے پاؤں ٹیڑھے ہیں اور گھٹنے ٹکراتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو خوبصورت پیدا کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) اس آدمی نے تاوافت اپنا تہبند نصف پنڈلی تک رکھا۔

(مسند الامام احمد: ۳۹۰/۴، ح: ۱۹۷۰۱، وسندہ صحیح ورجالہ ثقات)

⑦ عبد الرحمن بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے تہبند کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا، میں آپ کو بادل کیل جواب دیتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ((إزار المؤمن إلى أنصاف ساقیه، لا جناح علیه فیما بینہ و بین الکعبین، ما أسفل من ذلک ففی النار، ما أسفل من ذلک ففی النار، لا ینظر اللہ یوم القیامۃ إلی من جرّ إزاره بطرا)) ”مؤمن کے تہبند کی جگہ نصف پنڈلی

ہے۔ نصف پنڈلی اور ٹخنوں کے درمیان رکھے تو کوئی گناہ نہیں۔ (تہبندرکھنے کا) جو حصہ اس (ٹخنے) سے نیچے ہوگا، وہ آگ میں جلے گا، (تہبندرکھنے کا) جو حصہ اس (ٹخنے) سے نیچے ہوگا، وہ آگ میں جلے گا، جس نے تہبند کو تکبر کی وجہ سے (یعنی جان بوجھ کر) ٹخنوں سے نیچے لٹکایا، اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔“ (موطا الامام مالک: ۲/۹۱۴-۹۱۵، السنن الکبریٰ

للبيهقي: ۲/۲۴۴، شرح السنة للبعوي: ۳۰۸۰)

اس کی سند ”حسن“ ہے۔ اس کے راوی العلاء بن عبد الرحمن جہور کے نزدیک ”صدوق، حسن الحدیث“ ہیں اور صحیح مسلم کے مرکزی راوی ہیں۔

اس حدیث کو امام ابو عوانہ رحمہ اللہ (۴۸۳/۵) اور امام ابن حبان رحمہ اللہ (۵۴۴۷) نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

⑥ سیدنا ابوالدرداء رحمہ اللہ نے صحابی رسول سیدنا سہل بن خظیمہ رحمہ اللہ سے کہا، آپ ہمیں کوئی ایسی بات بتائیں، جو ہمیں فائدہ دے اور آپ کو نقصان نہ دے۔ اس پر انہوں نے کہا:

قال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم: نعم الرجل خريم الأسدي لولا طول جمته وإسبال إزاره، فبلغ ذلك خريما، فعجل، فأخذ شفرة، فقطع بها جمته إلى أذنيه ورفع إزاره إلى أنصاف ساقيه. ”خریم اسدی بھی کیا خوب آدمی ہے اگر اس کے

بال (کندھوں تک) لمبے نہ ہوں اور اس کی شلوار ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ یہ بات خریم اسدی رحمہ اللہ کو پہنچی تو انہوں نے جلدی سے استرا لیا اور بال کانوں تک کاٹ دیئے اور شلوار نصف پنڈلی تک اٹھا

لی۔“ (سنن ابی داؤد: ۴۰۸۹، مسند الامام احمد: ۴/۱۸۰، المستدرک علی الصحیحین للحاکم:

۱۸۴/۴، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے ”صحیح الاسناد“ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے۔

اس کا راوی ہشام بن سعد جہور کے نزدیک ”موثق، حسن الحدیث“ ہے۔ ان شاء اللہ!

⑨ سیدنا عمر بن خطاب رحمہ اللہ کا ایمان افروز واقعہ:

جب سیدنا عمر بن خطاب رحمہ اللہ کو ایک مجوسی یا عیسائی نے وار کر کے زخمی کر دیا اور آپ کا پیٹ چاک ہو گیا۔ آپ رحمہ اللہ کو نبیذ پلائی گئی، وہ آنتوں کے راستے باہر نکل آئی، دودھ لایا گیا، آپ نے پیا تو

وہ بھی آنتوں کے راستے باہر نکل آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانبر نہیں ہو سکیں گے۔ لوگ آپ کی تعریف کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان آیا، اس نے کہا، اے امیر المومنین! آپ کو بشارت ہو، آپ کو صحبت رسول کا شرف حاصل ہے، یقیناً آپ جانتے ہیں کہ آپ کو سبقت اسلام کا بھی شرف حاصل ہے، آپ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے عدل و انصاف کے پھریرے لہرادیئے، اب اللہ تعالیٰ آپ کو شہادت کے منصب پر فائز کرنے والے ہیں۔ (یہ سن کر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عاجزی و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا، میری خواہش ہے کہ یہ سب امور میرے لیے برابر ہو جائیں، نہ عذاب ہو نہ ہی ثواب! جب وہ نوجوان واپس پلٹا تو اس کا تہبند زمین پر لگ رہا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن اُحسی! ارفع ثوبک، فإنہ أنقی لثوبک وأتقی لربک۔ ”اے میرے بھتیجے! اپنا کپڑا اٹھوں سے اوپر اٹھالیں۔ اس میں آپ کے کپڑوں کی صفائی ہے اور تقویٰ کا باعث ہے۔“ (صحیح بخاری: ۳۷۰۰)

معلوم ہوا کہ کپڑا اٹھوں سے نیچے لٹکانا کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر قربان جائیے کہ آپ نے وقت وفات بھی مخالفت سنت کو برداشت نہ کیا، جبکہ آپ اس وقت زخموں سے پُور پُور تھے، خون میں لت پت تھے، زندگی اور موت کی کشمکش میں ایک نوجوان کو تہبند ٹخنے سے اوپر اٹھانا کہہ رہے ہیں، ساتھ ساتھ اس کی حکمت بھی عیاں کر دی اور رہتی دنیا تک کے نوجوانوں کو سبق دے دیا کہ ٹخنے ننگے رکھنا ضروری ہے۔ یہ تقویٰ کی بات ہے۔

⑩ مسلم بن یناق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی دیکھا، جو اپنا تہبند گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ آپ نے فرمایا، آپ کس قبیلہ سے ہو؟ اس نے اپنا نسب بیان کیا، وہ بنو لیث سے تھا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے پہچان لیا اور فرمایا کہ میں نے ان دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، جو شخص تکبر کے ارادہ سے تہبند لٹکائے گا، اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔“ (صحیح مسلم: ۴۵/۲۰۸۵)

⑪ محمد بن زیاد کہتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی دیکھا، جو اپنا تہبند گھسیٹ کر چل رہا تھا، وہ بحرین کا امیر تھا۔ زمین پر پاؤں مار مار کر کہہ رہا تھا کہ امیر آگیا، امیر آگیا۔ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص تکبر کی وجہ سے تہبند گھسیٹ کر چلے،

اللہ تعالیٰ اس کی طرف (روز قیامت) نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔“ (صحیح مسلم: ۲۰۸۷)

۱۲) ابواسحاق السبعی تابعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رأیت ناسا من أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأتزون علی أنصاف سوقهم ، فذكر أسامة بن زيد ، وابن عمر ، وزید بن أرقم ، والبراء بن عازب ... ”میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے بہت سے لوگ دیکھے ہیں، جو تہبند نصف پنڈلی پر رکھتے تھے، پھر انہوں نے سیدنا اسامہ بن زید، ابن عمر، زید بن ارقم اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۲/۸، ۳۹۳، وسندہ حسن)

۱۳) عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تہبند میں دیکھا، وہ آگے سے اس کا کونہ اپنے پاؤں کی پیٹھ پر رکھتے اور پیچھے سے اٹھا کر رکھتے تھے۔ میں نے کہا، آپ اس طرح تہبند کیوں باندھتے ہیں؟ فرمانے لگے کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح باندھتے تھے۔“

(سنن ابی داؤد: ۴۰۹۶، وسندہ حسن)

کسی صحابی سے جان بوجھ کر ٹخنے سے نیچے کپڑا ٹکانا ثابت نہیں ہے۔

۱۴) محمد بن سیرین تابعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ (صحابہ و تابعین) نصف پنڈلی سے اوپر تہبند اٹھا کر رکھنا پسند کرتے تھے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۲/۸، وسندہ حسن)

تنبیہ نمبر ①: سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کپڑا ٹکاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا، میں پتلی پنڈلیوں والا انسان ہوں۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۹/۸، وسندہ حسن)

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اس کی سند کو ”جید“ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اس کو اس حالت پر محمول کریں گے کہ وہ جگہ جہاں شلوار رکھنا مستحب ہے، یعنی نصف پنڈلی، اس سے زیادہ لٹکی ہوئی تھی، کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے ٹخنوں سے نیچے تہبند کو لٹکایا ہو۔ پنڈلیوں کے باریک ہونے کی علت اسی طرف رہنمائی کرتی ہے۔۔۔“ (فتح الباری: ۱۰/۲۶۴)

تنبیہ نمبر ②: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله إليه يوم القيامة ، قال أبو بكر: يا

رسول اللہ! إن أحد شقى إزارى يسترخى إلا أن أتعاهد ذلك منه ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : لست ممّن یصنعه خیلاء . ”جس نے تکبر کی وجہ سے کپڑا گھسیٹا، روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے، اے اللہ کے رسول! میرے تہبند کا ایک پہلو لٹک جاتا ہے، ہاں جب میں اس پر محافظت کروں تو نہیں لٹکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو تکبر کی وجہ سے کپڑا لٹکاتے ہیں۔“ (صحیح بخاری : ۵۷۸۴)

ایک روایت میں ہے: فقال أبو بکر : إنه یسترخی إزارى أحياناً .

”سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا، کبھی کبھار میرا تہبند (غیر ارادی طور پر) خود بخود لٹک جاتا ہے۔“

(مسند الامام احمد : ۱۴۷/۲، مسند ابی یعلیٰ : ۵۶۴۴، شعب الایمان للبیہقی : ۶۱۱۹،

وسندہ صحیح)

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جو تکبر کے ارادے سے لٹکاتا ہے، وہ اس وعید میں داخل ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان جان بوجھ کر کپڑا اٹخوں سے نیچے لٹکاتا ہے، خواہ تکبر کا قصد ہو یا نہ ہو، اس کے لیے یہ وعید شدید ہے۔

ہاں! اگر کوئی آدمی کپڑا اٹخوں سے اوپر رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود غیر ارادی یا غیر اختیاری طور پر کپڑا نیچے لٹک جاتا ہے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ وہ معذور ہے، جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں پوری پوری محافظت کرتا ہوں تو تہبند نیچے نہیں لٹکتا۔ کبھی ذرا سی غفلت کروں تو نیچے لٹک جاتا ہے۔ حدیث میں یسترخی کا لفظ بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ تہبند خود بخود نیچے لٹک جاتا تھا، وہ بھی کبھی کبھار نہ کہ ہمیشہ۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ قصداً نہیں لٹکاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ وعید ہر اس انسان کو شامل ہے، جو تکبر کے ارادے سے لٹکایا ہے یا بغیر تکبر کے ارادے سے۔ تب ہی تو یہ سوال کیا تھا کہ غیر ارادی طور پر غفلت کی وجہ سے میرا تہبند لٹک جاتا ہے۔ کیا میں بھی اسی وعید میں داخل ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں۔

ہاں! اگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ پوچھتے کہ میں خود شلوار اٹخنے سے نیچے لٹکا کر رکھتا ہوں اور میرا تکبر کا ارادہ نہیں ہوتا، پھر اگر آپ ﷺ اجازت دے دیتے تو بات صحیح ہوتی، جبکہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں

ہے، لہذا یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو جان بوجھ کر کپڑا لٹکا رہا ہے، خواہ تکبر کا قصد نہ بھی ہو، وہ اس وعید میں داخل ہے، کیونکہ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا بذات خود تکبر ہے۔ اس میں قصد و ارادہ کا کوئی عمل دخل نہیں۔

تنبیہ نمبر ③ : سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس

تھے کہ سورج کو گھن لگ گیا۔ رسول اللہ ﷺ یجڑ ردائہ، حتیٰ دخل المسجد ...
 ”آپ ﷺ تہبند گھسیٹتے ہوئے (جلدی سے) کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ آپ مسجد میں تشریف لے آئے تو ہم بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں۔“

(صحیح بخاری: ۱۰۴۰)

دوسری روایت میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب خواب میں اذان سنی، پھر حالت بیداری میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سن کر گھر سے باہر نکلے تو فخر جیجڑ ردائہ ... ”آپ تہبند گھسیٹتے ہوئے نکلے۔“ (مسند الامام احمد: ۴/۴۳، سنن ابی داؤد: ۴۹۹، وسندہ حسن و محمد ابن اسحاق موثق عند الجمهور)

اس حدیث کو امام ابن الجارود (۱۵۸)، امام ابن خزیمہ (۳۷۱)، امام ابن حبان (۱۶۷۹) اور حافظ نووی رحمہ اللہ (خلاصۃ الاحکام: ۲۷۶/۱) نے ”صحیح“ کہا ہے۔
 امام ترمذی رحمہ اللہ (۱۷۹) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (تسلیح الافکار: ۱/۳۳۸) نے ”حسن صحیح“ قرار دیا ہے۔

یہ اور اس جیسی دوسری احادیث کا مطلب یہ ہے کہ اوپر والی چادر گھسٹ رہی تھی نہ کہ تہبند، کیونکہ رداء اوپر والی چادر کو کہتے ہیں۔ ورنہ تہبند کو لٹکانے سے تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے وقت وفات بھی منع فرمایا تھا۔

⑤ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: أخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بعضلة ساقى أو بعضلة ساقه، قال: فقال: الإزار هاهنا، فإن أبيت فهاهنا، فإن أبيت فهاهنا، فإن أبيت فلا حق للإزار في الكعبين ...

”رسول اللہ ﷺ نے میری پنڈلی پکڑ کر فرمایا، تہبند کو یہاں رکھو، اگر آپ انکاری ہیں تو یہاں

رکھو، اگر آپ انکاری ہیں تو یہاں رکھو، اگر آپ انکاری ہیں تو (یاد رکھو) ٹخنے پر تہبند کا کوئی حق نہیں۔“

(مسند الامام احمد: ۳۹۶/۵، وسندہ حسن)

اس کا راوی مسلم بن نذیر ”حسن الحدیث“ ہے۔ امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

لا بأس بحديثه . ”اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں۔“ (الجرح والتعديل: ۱۹۷/۸)

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ (۱۷۸۳) نے اس کی حدیث کو ”حسن صحیح“ کہا ہے۔ یہ تو ثیق ہے۔

یہ حدیث واضح طور پر پتہ دے رہی ہے کہ جان بوجھ کر، خواہ تکبر کا ارادہ نہ بھی ہو تو کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹکا ہی نہیں سکتے۔

فائدہ نمبر ①: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”مطلق طور پر ٹخنوں

سے نیچے شلوار لٹکانے کے بارے میں جو وعید آتی ہے، اس سے وہ شخص مستثنیٰ ہے، جو ضرورت و عذر کے پیش نظر لٹکاتا ہے۔ مثال طور پر ٹخنے پر زخم ہے۔ کھیاں تکلیف پہنچاتی ہیں۔ وہ شلوار یا چادر کے علاوہ کوئی دوسری چیز ڈھانپنے کے لیے نہیں پاتا۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو غار کی وجہ سے ریشمی قمیص پہننے کی اجازت دی تھی۔“ (فتح الباری: ۲۵۷/۱۰)

عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، والی روایت صحیح بخاری (۵۸۳۹) اور صحیح مسلم (۲۰۷۶) میں موجود ہے۔

فائدہ نمبر ②: عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹخنے ڈھانپ کر رکھیں،

جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے تکبر کی وجہ سے کپڑا لٹکایا، اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، اے اللہ کے رسول! فکیف یصنع النساء بذیولھن؟ قال: ترخینہ شبراً، قال:

قالت: إذا تنكشف أقدامھن؟ قال: ترخینہ ذراعاً، لا یزدن علیہ ((

”عورتیں کپڑے کا دامن کہاں رکھیں گی؟ وہ (نصف پنڈلی سے) ایک (درمیانے ہاتھ کی) بالشت (گن انگلی اور انگوٹھے کے درمیان فاصلہ کے) لٹکا کر رکھیں۔ راوی کہتے ہیں کہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا، تب تو ان کے پاؤں ننگے ہو جائیں گے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، وہ دو بالشت نیچے رکھ سکتی ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔“



(سنن النسائي: ٥٣٣٨، سنن الترمذی: ١٧٣١، وسنده صحيح)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ”حسن صحیح“ ہے۔

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وفي الحديث رخصة للنساء في جرّ الإزار لأنه يكون أستر لهنّ. ”اس حدیث میں عورتوں کے لیے کپڑا گھسیٹنے کی رخصت ہے، کیونکہ ان کے لیے زیادہ ستر کا باعث ہے۔“

ایک شبہ اور اس کا ازالہ : وہ احادیث جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر نہیں ہے، ان کے عموم کو ان احادیث کے ساتھ خاص کر دیا جائے گا، جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر ہے، یعنی یہ وعید صرف اس شخص کے لیے ہوگی، جو تکبر کی بنا پر کپڑا اٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔

خوب یاد رہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے، ورنہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا عورتوں کے کپڑا لٹکانے کے بارے میں استفسار کا کیا معنی؟ بلکہ حدیث سننے کے بعد وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ تکبر کا ارادہ ہو یا نہ ہو، یہ ممانعت عام ہے۔ اس لیے سوال کیا کہ عورتوں کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ ان کو پاؤں ڈھانپنے کے لیے کپڑا لٹکانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب تو نبی اکرم ﷺ نے واضح کیا کہ وہ اس مسئلہ میں مردوں کے حکم سے خارج ہیں۔ عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹخنے ڈھانپ کر رکھیں۔ یہ مسلمانوں کا اجماعی مسئلہ ہے، اس لیے نصف پنڈلی سے ایک بالشت نیچے کپڑا رکھنا مستحب اور دو بالشت جائز ہے۔ اسی طرح مردوں کے ٹخنے سے نیچے تہہ بند، چادر، پاجامہ، شلوار وغیرہ رکھنا ممنوع و حرام اور گناہ کبیرہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کا باعث ہے۔ مرد کے لیے نصف پنڈلی تک کپڑا رکھنا مستحب اور ٹخنے سے اوپر رکھنا جائز ہے۔

فائدہ نمبر ③ : سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

ما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في الإزار فهو في القميص .

”جو حکم آپ ﷺ کا تہبند کے بارے میں دیا ہے، وہی قمیص کے بارے میں بھی ہے۔“

(مسند الامام احمد: ١١٠/٢، ١٣٧، سنن ابی داؤد: ٤٠٩٥، السنن الكبرى للبيهقي:

٢٤٤/٢، وسنده صحيح)

مطلب یہ ہے کہ قمیص بازینت اور ستر پوش ہو، ضرورت سے زیادہ لمبی اور کھلی ہوگی تو تکبر میں

شامل ہو جائے گی، جو کہ ممنوع اور حرام ہے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: **الإسبال فی الإزار والقميص والعمامة .**

”اسبال تہبند، قمیص اور پگڑی (سب) میں (ممنوع) ہوتا ہے۔“ (سنن ابی داؤد: ۴۰۹۴، سنن

النسائی: ۵۳۳۴، سنن ابن ماجہ: ۳۵۷۶، وسندہ صحیح)

اسبال، ارسال اور اراء، یہ تینوں ہم معنی ہیں۔ تہبند، قمیص اور پگڑی سب میں اسبال ہوتا ہے۔ شریعت نے ہر ایک کی حدود مقرر کی ہیں۔ تہبند کے حوالے سے مرد کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ ٹخنے سے نیچے نہ لٹکائے، اسی طرح قمیص کے بارے میں بھی گزر چکا ہے۔

جہاں تک پگڑی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں شریعت کی رہنمائی یہ ہے کہ نہ تو اس کے زیادہ بل ہوں، نہ اس کا کوئی کونہ یا سر از زیادہ لٹکا ہوا ہو۔ اگر ممنوع اسبال کی صورت اختیار کر گئی تو یہ تکبر ہے اور ممنوع ہے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: **كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا اعتَّم سدل عمامته بين كتفيه .** ”نبی اکرم ﷺ جب پگڑی باندھتے

تو اس کا سر دونوں کندھوں کے درمیان لٹکاتے تھے۔“ (سنن الترمذی: ۱۷۳۶، وسندہ حسن)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”حسن غریب“ کہا ہے۔

اس کا راوی یحییٰ بن محمد المدنی الجاری ”حسن الحدیث“ ہے۔ امام عجل، امام ابن حبان، یحییٰ بن محمد کے شاگرد یحییٰ بن یوسف الزمی نے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لیس بحديثه بأس . ”اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اس کے دوسرے راوی عبدالعزیز بن محمد الدراوردی بھی جمہور کے نزدیک ”ثقة“ ہیں۔

سیدنا عمرو بن حریش رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نمبر پر دیکھا کہ آپ نے کالی پگڑی باندھ رکھی تھی، اس کے دونوں کونے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکا رکھے تھے۔

(صحیح مسلم: ۱۳۵۹)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: **وَعَمَّمَهُ بَعِمَامَةً بَيْضَاءَ ، وَأَرْسَلَ مِنْ**

خَلْفَهُ أَرْبَعُ أَصَابِعَ أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ ، وَقَالَ : هَكَذَا يَا ابْنَ عَوْفٍ اَعْتَمَّ ! فَإِنَّهُ أَعْرَبَ

وأحسن . ”نبی اکرم ﷺ نے ان (سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ) کو سفید پگڑی باندھی، چار انگلیوں یا ان کے قریب قریب سر ان کے پیچھے ڈال دیا اور فرمایا، اے (عبدالرحمن) ابن عوف! اس طرح پگڑی باندھا کرو، کیونکہ یہ زیادہ واضح اور زیادہ خوبصورت ہے۔“

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم : ۵۴۰/۴، وسندہ صحیح)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”صحیح الاسناد“ کہا ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے۔ یہ سند اس بات پر واضح دلیل ہے کہ امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سماع و لقاء ثابت ہے۔ السنۃ شمارہ نمبر ① صفحہ نمبر ۳۰ پر لکھا گیا تھا کہ ان کا سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سماع نہیں ہے۔ یہ بات مرجوح ہو گئی ہے۔

✽ محمد بن زید العمری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ انہوں نے کالی پگڑی باندھ رکھی تھی، دو بالشت کے برابر اس کا سر پیچھے ڈالا ہوا تھا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۴۲۲/۸، وسندہ صحیح)

فائدہ نمبر ③ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی ٹخنوں سے

نیچے کپڑا لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا، جاؤ وضو کرو۔ وہ گیا اور وضو کیا، پھر (ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکاتا ہوا) آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، جاؤ اور وضو کرو۔ وہ دوبارہ گیا، وضو کیا، پھر آیا تو ایک آدمی نے کہا، اے اللہ کے رسول! کیا وجہ ہے کہ آپ نے ایک با وضو انسان کو وضو کرنے کا حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، وہ شلوار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ شلوار لٹکانے والے شخص کی نماز قبول نہیں فرماتے۔“ (مسند الامام احمد : ۴/۶۸، سنن ابی داؤد : ۶۳۸، ۴۰۸۶، السنن

الکبریٰ للنسائی : ۹۷۰۳، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۲/۲۴۱، وسندہ حسن، ابو جعفر المدنی المؤذن حسن الحدیث، حسن الترمذی حدیثہ (۳۴۴۸) وصححہ ابن حبان (۲۶۹۹)، وهذا توثیق منہما، وروی عنہ یحییٰ بن ابی کثیر وقال الامام ابو حاتم الرازی : یحییٰ بن ابی کثیر امام لا یحدث إلا عن ثقة (الجرح والتعديل : ۱۴۲/۹)، قال الحافظ النووی (ریاض الصالحین : ۷۹۵) : رواہ ابو داؤد بإسناد صحیح علی شرط مسلم، ووافقه الذہبی (الکبائر ص ۱۷۹)، وقال الحافظ الہیثمی (مجمع

الزوائد : ۱۲۵/۵) : رواہ أحمد ورجاله رجال الصحیح

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں فرماتے۔ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ وضو اور نماز لوٹائے۔

صاحب المنہل العذب المورود (۱۲۳/۵) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ”ضعیف“ ہے، بالفرض ثابت ہو بھی جائے تو یہ منسوخ ہے، کیونکہ اس کے خلاف اجماع واقع ہو گیا ہے۔

لیکن ان کا اس حدیث کو ”ضعیف“ کہنا صحیح نہیں ہے، ہم نے اس کی سند کا ”حسن“ ہونا بطریق احسن واضح کر دیا ہے، نیز اس کی منسوخیت کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ ہم اس اجماع سے واقف نہیں ہو سکے، جو اس کے خلاف ہوا ہے، بلکہ اس موہوم اجماع کے خلاف ثابت ہے، جیسا کہ:

مجاہد بن جبر تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کان یقال: من مس إزاره كعبه لم تقبل له صلاة، قال: وقال ذرّ: من مس إزاره الأرض لم تقبل له صلاة.

”کہا جاتا تھا کہ جس کا تہبند ٹخنے کو چھو جائے، اس کی نماز قبول نہیں ہوتی، (حصین بن عبدالرحمن المسلمی تابعی رحمہ اللہ) کہتے ہیں کہ ذر (بن عبداللہ الہمدانی) نے کہا، جس کا تہبند زمین کو چھوئے، اس کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۸/۸، وسندہ صحیح)

لہذا اجماع کا یہ دعویٰ باطل ہوا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ووجه هذا الحديث - والله أعلم - أن إسبال الإزار معصية، وكلّ من واقع معصية، فإنه يؤمر بالوضوء والصلاة، فإنّ الوضوء يطفىء حريق المعصية.

”اس حدیث کی توجیہ یہ ہے کہ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا معصیت ہے، جو بھی کسی معصیت میں مبتلا ہوگا، اسے وضو اور نماز کا حکم دیا جائے گا، کیونکہ وضو معصیت (نافرمانی) کی آگ کو بجھاتا ہے۔“ (التہذیب علی سنن ابی داؤد: ۵۰/۶)

علامہ طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لعلّ السرّ فی أمره بالتّوضیء، وهو طاهر، أن يتفكّر الرّجل فی سبب ذلك الأمر، فيقف علی ما ارتكبه من شتعاء، وأنّ اللّٰه تعالیٰ ببرکة أمر رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیہ وسلّم طهارة الظّاهر، يطهّر باطنه من التّکبّر والخیلاء، لأنّ طهارة الظّاهر مؤثّرة فی طهارة الباطن.

”با وضو انسان کو وضو کا حکم دینے میں شاید یہ حکمت پنہاں ہو کہ (دوبارہ وضو کرنے کے بارے

میں) حکم میں وہ غور و فکر کرے، جس بُری حرکت کا وہ مرتکب ہو رہا ہے، اس پر خبردار ہو جائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے ظاہری طہارت کے حکم (کی تعمیل) کی برکت سے اس کے باطن کو تکبر اور افتخار و عجب سے پاک کر دے گا، کیونکہ ظاہری طہارت باطنی طہارت پر اثر انداز ہوتی ہے۔“

(شرح الطیبی: ۲/۲۶۸)

علامہ ابن العربی المالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: إِنَّ الصَّلَاةَ حَالُ تَوَاضُعٍ وَإِسْبَالِ الْإِزَارِ فَعَلٌ مُتَكَبِّرٌ، فَتَعَارُضًا، وَأَمْرُهُ لَهُ بِإِعَادَةِ الْوُضُوءِ أَدَبٌ لَهُ وَتَأْكِيدٌ عَلَيْهِ، وَلِأَنَّ الْمَصْلَى يَنَاجِي رَبَّهُ، وَاللَّهُ لَا يَنْظُرُ إِلَى مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ، وَلَا يَكَلِّمُهُ، فَكَذَلِكَ لَمْ يَقْبَلْ صَلَاتَهُ.

”نماز تواضع کی حالت ہوتی ہے، جبکہ کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکانا متکبر آدمی کا کام ہے، یہ دونوں کام باہم متعارض ہیں۔ اس شخص کو وضو لوٹانے کا حکم اسے ادب سکھانے اور تاکید کرنے کا سبب ہے، کیونکہ نمازی اپنے رب سے مناجات (سرگوشیاں) کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کپڑا اٹھینے والے شخص کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی اس سے کلام کریں گے، اسی لیے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔“ (عارضۃ الاحوذی: ۷/۲۳۸)

اس بات کی تاکید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

①۶ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنْظُرُ إِلَى مَسْبِلِ الْإِزَارِ. ”یقیناً اللہ تعالیٰ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانے والے کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھتے۔“ (مسند الامام احمد: ۱/۳۲۲، سنن النسائی:

۵۳۳۵، مصنف ابن ابی شیبہ: ۸/۳۸۸، وسندہ صحیح)

حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

①۷ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے

ہوئے سنا: مَنْ أَسْبَلَ إِزَارَهُ فِي صَلَاتِهِ خِيَلًا، فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي حَلٍّ وَلَا حَرَامٍ.

”جس نے تکبر کی وجہ سے نماز میں کپڑا لٹکایا، اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی سروکار نہیں (یا اللہ تعالیٰ

اس کے لیے جنت کو حلال کریں گے نہ دوزخ کو حرام)۔“ (سنن ابی داؤد: ۶۳۷، السنن الکبریٰ

للسنائی: ۹۶۸۰، وسندہ حسن)

اگر کوئی کہے کہ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر تکبر کا ارادہ نہ ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالف تب ہوگا، جب کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ یہاں تو نص موجود ہے کہ ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا ہی تکبر ہے، لہذا جو بھی جان بوجھ کر کپڑا لٹکائے گا، وہ اس زمرہ میں آئے گا، خواہ تکبر کا ارادہ نہ بھی ہو۔

الحاصل : وہ احادیث جن میں خیلاء (تکبر کی وجہ سے) کپڑا لٹکانے کا ذکر ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ جان بوجھ کر جو بھی کپڑا لٹکائے گا، کیونکہ بھول کر لٹک جانے سے تکبر ہوتا ہی نہیں۔ اور جان بوجھ کر کپڑا لٹکانا خود تکبر ہے، جیسا کہ حدیث سے واضح کیا جا چکا ہے۔

مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانا ممنوع و حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سِتَّةَ لَعْنَتِهِمْ وَلَعْنَهُمُ اللَّهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي .

”چھ شخص ایسے ہیں، جن پر میں نے لعنت کی ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہے۔۔۔ (ان میں سے ایک) وہ شخص ہے، جو میری سنت کو چھوڑتا ہے۔“ (سنن الترمذی : ۲۱۵۴، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۵۷۴۹) اور امام حاکم رحمہ اللہ (۵۲۵/۲) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

اس حدیث کے راوی عبد الرحمن بن ابی الموال کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ثقة مشہور . ”یہ مشہور ثقہ راوی ہے۔“ (المغنی للذهبی : ۶۱۴/۲)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: من ثقات المدنيين . ”یہ ثقہ مدنی

راویوں میں سے ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر : ۱۸۳/۱۱)

اس کا دوسرا راوی عبید اللہ بن عبد الرحمن بن موہب ”مختلف فیہ“ ہے۔ راجح یہی ہے کہ وہ جمہور کے نزدیک ”حسن الحدیث“ ہے۔

یاد رہے کہ اس حدیث میں سنت سے مراد واجبی اور فرضی سنتیں، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ڈاڑھی رکھنا، شلوار ٹخنوں سے اوپر رکھنا وغیرہ مراد ہیں۔ اب جو بھی شخص جان بوجھ کر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا، اس فرمان نبوی کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اس پر لعنت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی لعنت سے دُور رکھے اور اپنی رحمت کا مستحق بنائے! آمین

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

رقص کی شرعی حیثیت

رقص جاہل و بے عقل اور بے دین صوفیوں کی ایجاد کردہ بدعت ہے۔ یہ بالاجماع ممنوع ہے۔ سلف صالحین و ائمہ دین میں سے کوئی اس کا قائل و فاعل نہیں رہا، البتہ اہل علم سے اس کی مذمت اور ممانعت ضرور ثابت ہے۔

✽ علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ نے (م ۸۵۵ھ) نے صوفیوں کی کارستانیوں کے ذکر و رد میں کیا خوب کہا ہے: ولا اعتبار لما أبدعته الجهلة من الصوفية في ذلك (أى الغناء وغيره)، فإنك إذا تحققت أقوالهم في ذلك ورأيت أفعالهم وقفت على آثار الزنادقة منهم۔ ”اور (غناء وغیرہ کے نام پر) جاہل صوفیوں نے جو بدعات نکال لی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ آپ جب اس بارے میں ان کے اقوال کی تفتیش کریں گے اور ان کے افعال کو دیکھیں گے تو ان میں بے دین و زندق لوگوں کی علامات پائیں گے۔“

(عمدة القاری: ۴۰۱/۲۱)

رقص غیر شرعی رسم ہے، جو دین کے نام پر جاری کر دی گئی ہے، لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ (م ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں: وقد انعقد اجتماع العلماء أن من ادّعى الرقص قربه إلى الله تعالى فقد كفر۔ ”اس بات پر علمائے کرام کا اتفاق و اجماع واقع ہو چکا ہے کہ جو شخص رقص کو قرب الہی کا ذریعہ قرار دے، وہ کافر ہے۔“

(صيد الخاطر لابن الجوزی: ص ۱۵۴)

علامہ احمد حنطادوی حنفی (م ۱۳۳۳ھ) لکھتے ہیں: وأما الرقص والتصفیق والصّريخ وضرب الأوتار والضّجّ والبوق الذى يفعله بعض من يدّعى التّصوّف، فإنّه حرام بالإجماع، لأنّها زىّ الكفّار۔ ”رہا رقص کرنا، تالیاں پیٹنا، شور شرابا، ہارمونیم بجانا، چیخ و پکار اور بگل بجانا، جو کہ صوفیت کے بعض دعویداروں کا معمول ہے، یہ بالاجماع حرام ہے،

کیونکہ یہ کفار کا طور طریقہ ہے۔“ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۱۷۴، صفۃ الاذکار)

حسکفی حنفی لکھتے ہیں: **من يستحل الرقص قالوا بكفره ، ولا سيما بالذق يلهو ويزمر .** ”جو رقص کو حلال سمجھتا ہے، وہ ان (علمائے کرام) کے بقول کافر ہے، خصوصاً جو ساتھ ساتھ کھیل تماشا کرتا اور ساز بجاتا ہے۔“ (الدر المختار: ۴/۴۴۶)

اس قول کی تشریح میں ابن عابدین شامی حنفی (۱۱۹۸-۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

والمراد به التمايل والخفض والرفع بحركات موزونة كما يفعله بعض من ينتسب إلى التصوف ، وقد نقل في البزازیة من القرطبي إجماع الأئمة على حرمة الغناء وضرب القصب والرقص . ”اس (رقص) سے مراد جھومنا اور موزون حرکات کے ساتھ نیچے اوپر ہونا ہے، جیسا کہ بعض وہ لوگ کرتے ہیں، جو تصوف کا دم بھرتے ہیں۔ بزازیہ میں علامہ قرطبی سے غناء، ڈھول پیٹنے اور رقص کرنے کی حرمت پر ائمہ کا اجماع و اتفاق نقل کیا گیا ہے۔“

(فتاویٰ شامی: ۴/۴۴۶)

مشہور مفسر علامہ قرطبی رحمہ اللہ (۶۰۰-۶۷۱ھ) لکھتے ہیں: **استدل العلماء بهذه الآية على ذم الرقص وتعاطيه ، قال الإمام أبو الوفاء ابن عقيل : قد نص القرآن على النهي عن الرقص ، فقال : ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ﴾ وذم المختال والرقص أشد المرح والبطر .** ”اس آیت کریمہ سے علمائے کرام نے رقص اور اس میں انہماک کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ امام ابو الوفاء ابن عقیل کا فرمان ہے کہ قرآن کریم نے رقص کی ممانعت پر نص قائم کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ﴾ (اور زمین پر اکڑ کر مت چلو)، جھومنا (ناچنا) اور رقص کرنا تکبر و غرور سے بھی (گناہ میں) سخت ہے۔“ (تفسیر القرطبی: ۱۰/۲۶۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴾ (لقمان: ۳۱/۶)

”اور کچھ لوگ بے ہودہ باتیں خریدتے ہیں تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کریں اور اسے مذاق بنائیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

رقص ابوالمحریث ہے، لہذا ممنوع و حرام ہے۔

اس کے باوجود بعض گمراہ صوفی اس بدعتِ قبیحہ اور شنیعہ کو شرعی دلائل سے کشید کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں، جیسا کہ:

دلیل نمبر ①: سیدنا ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسِلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ﴾ (ص: ۴۲/۳۸)

” (ہم نے حکم دیا اے ایوب! اپنا پاؤں ماریں، (دیکھو) یہ نہانے کے لیے ٹھنڈا اور پینے کو (میٹھا پانی ہے)۔“

علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: استدلال بعض الجهال المتزهدة وطعام

المتصوفة بقوله تعالى 'لأَيُّوبَ: ﴿أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ على جواز الرقص ...

”بعض زہد و تقویٰ کی ملمع سازی کرنے والے جاہلوں اور صوفی ازم کا نعرہ بلند کرنے والے کمینے

لوگوں نے سیدنا ایوب علیہ السلام کو جاری کیے گئے فرمانِ باری تعالیٰ ﴿أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ (ص: ۴۲/۳۸)

سے رقص کے جواز پر استدلال کیا ہے۔“ (تفسیر القرطبی: ۲۱۵/۱۵)

حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ گمراہ صوفیوں کے رد و جواب میں لکھتے ہیں:

وهذا الاحتجاج بارد ، لأنه لو كان أمر بضرب الرجل فرحا كان لهم فيه شبهة

، وإنما أمر بضرب الرجل لينبع الماء ، قال ابن عقيل : أين الدلالة في مبتلى أمر

عند كشف البلاء بأن يضرب برجله الأرض لينبع الماء إعجازا من الرقص ، ولئن

جاز أن يكون تحريك رجل قد أنحلها تحكم الهوام دلالة على جواز الرقص في

الإسلام جاز أن يجعل قوله تعالى 'لموسى: ﴿اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ دلالة

على ضرب الجماد بالقضبان ، نعوذ بالله من التلاعب بالشَّرْع .

”یہ استدلال بالکل بودا ہے، کیونکہ اگر پاؤں مارنے کا حکم خوشی کے لیے دیا گیا ہوتا تو ان کے

لیے اس استدلال کی کوئی گنجائش ہوتی، سیدنا ایوب علیہ السلام کو تو اس لیے پاؤں مارنے کا حکم دیا گیا تھا کہ

پانی پھوٹ پڑے۔ ابنِ عقیل کہتے ہیں کہ ایک بیمار آدمی، جسے بیماری سے نجات پانے کے لیے معجزہ کے

طور پر پانی نکالنے کے لیے زمین پر پاؤں مارنے کا حکم دیا گیا، اس سے رقص کی دلیل کہاں سے آگئی؟

اگر کیڑوں کے کھائے ہوئے (سیدنا ایوب علیہ السلام) کے جسم مبارک میں کیڑوں کا پڑنا بے ثبوت بات ہے۔ غ۔ م) پاؤں کو حرکت دینے سے اسلام میں رقص کی دلیل لینا جائز ہے تو یہ بھی جائز ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کے حکم کو جمادات کو ڈنڈے سے پیٹنے کی دلیل بنانا بھی جائز ہونا چاہیے۔ شریعت کو کھیل تماشا بنانے سے اللہ کی پناہ!“ (تلبیس ابلیس لابن الجوزی: ۱/۲۳۰)

دلیل نمبر ۲) : سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

وكان يوم عيد يلعب فيه السودان بالدرق والحراب ، فإما سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم وإما قال : أتشتهين نظرين ؟ قلت : نعم ! فأقمني ورائه ، خذى على خدّه ، وهو يقول : دونكم يا بنى أرفدة ، حتى إذا مللت ، قال : حسبك ، قلت : نعم ! قال : فاذهبي . ”عید کا دن تھا، حبشی لوگ ڈھالوں اور نیزوں کے ساتھ (جنگی کھیل) کھیل رہے تھے۔ یا تو میں نے سوال کیا تھا یا پھر رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا تھا، کیا آپ دیکھنے کی خواہش مند ہیں؟ میں نے عرض کی، جی ہاں! آپ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا، میرا رخسار آپ کے رخسار مبارک کے اوپر تھا، آپ ﷺ فرما رہے تھے، کھیلتے رہو، اے بنی ارفدہ! جب میں تھک گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، بس؟ میں نے عرض کی، جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا، اچھا جاؤ۔“ (صحیح بخاری: ۹۵۰، صحیح مسلم: ۲۰/۸۹۲)

صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: جاء حبش يزفنون في يوم عيد في المسجد . ”ایک بار عید کے دن حبشی لوگ آکر مسجد میں جنگی مشقیں کرنے لگے۔“

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے کی روایت ہے: كانت الحبشة يزفنون بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم ويرقصون ويقولون : محمد عبد صالح ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما يقولون ؟ قالوا : يقولون : محمد عبد صالح . ”حبشی لوگ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جنگی مشقیں کر رہے تھے اور رقص کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے، محمد ﷺ نیک آدمی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا، یہ کیا کہتے ہیں؟ صحابہ نے بتایا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ محمد ﷺ نیک آدمی ہیں۔“

(مسند الامام احمد: ۱۵۲/۳، وسندہ صحیح وصححه ابن حبان: ۵۸۷۰)

صحیح ابن حبان میں الفاظ ہیں: ویتکلمون بکلام لا يفهمه .

”وہ ایسی کلام کر رہے تھے، جسے آپ ﷺ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے: وہم يلعون ويرقصون .

”وہ کھیل رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔“ (المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۱۳۵۹)

اس کی سند سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ: ① امام طبرانی رحمہ اللہ کے شیخ ہاشم بن مرشد کی توثیق ثابت نہیں۔ ② قرظہ راوی ”مجهول“ اور غیر معروف ہے۔ اس کو حافظ ذہبی رحمہ اللہ (المیزان: ۳۸۷/۳) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (التقريب: ۵۵۳۵) نے لا يُعرف (غیر معروف) کہا ہے، لہذا سند سخت ”ضعیف“ ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۴۷۳-۸۵۲ھ) لکھتے ہیں: واستدلّ قوم من الصّوفية بحديث الباب على جواز الرّقص وسما ع آلات الملاهي ، وطعن فيه الجمهور باختلاف المقصدين ، فإنّ لعب الحبشة بحرابهم كان للتمرين على الحرب ، فلا يحتجّ به للرّقص في اللّهُو . ”صوفیوں کے ایک گروہ نے اس حدیث سے رقص اور آلات موسیقی کے سماع پر استدلال کیا ہے۔ جمہور علمائے کرام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے دونوں مقصد مختلف ہیں، کیونکہ حبشی لوگ تو جنگی مشق کے لیے نیزوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، لہذا اس سے لہو و لعب میں رقص کرنے پر کوئی دلیل نہیں لی جاسکتی۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۵۵۳/۶)

حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ (۵۹۷ھ) لکھتے ہیں: زفن الحبشة نوع من المشي ، يفعل عند اللّقاء للحرب . ”حبشی لوگوں کے رقص سے مراد ایک قسم کی چال ہے، جو جنگ میں دشمن سے ملاقات کے وقت چلی جاتی ہے۔“ (تلبیس ابلیس لابن الجوزی: ۲۳۰/۱)

یہی بات علامہ قرطبی مفسر رحمہ اللہ نے فرمائی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۲۱۵/۱۵)

حافظ نووی رحمہ اللہ یزفنون کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

معناه يرقصون ، وحمله العلماء على التّوثب بسلاحهم ولعبهم بحرابهم على قريب من هيئة الرّقص ، لأنّ معظم الرّوايات إنّما فيها لعبهم بحرابهم ، فتأوّل هذه اللفظة على موافقة سائر الرّوايات . ”اس کا معنی رقص کرنا ہے، علمائے کرام نے اس سے

مراد اسلحہ کے ساتھ ان کا اچھلنا کودنا اور نیزوں کے ساتھ ان کا کھیلنا مراد لیا ہے، جو کہ رقص کی کیفیت سے قریب قریب ہوتا ہے۔ چونکہ اکثر روایات میں ان کے نیزوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر ہے، لہذا اس لفظ کی باقی روایات کے مطابق ہی تفسیر کی جائے گی۔“ (شرح صحیح مسلم للنووی: ۱۸۶/۶)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **بينما الحبشة يلعبون عند رسول الله صلى الله عليه وسلم بحرا بهم** إذ دخل عمر بن الخطاب ، فأهوى إلى الحصاء يحصبهم بها ، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا عمر ! دعهم . ”اس دوران کہ حبشی لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے نیزوں کے ساتھ (جنگی کھیل) کھیل رہے تھے کہ اچانک سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور وہ کنکریوں کی طرف جھکے کہ ان کو ماریں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے عمر! ان کو چھوڑ دو۔“

(مسند الامام احمد: ۳۰۸/۲، صحیح بخاری: ۲۹۰۱، صحیح مسلم: ۸۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حبشی لوگ عید کے دن، یعنی خوشی کے موقع پر جنگی مشقوں میں مصروف تھے۔ وہ یہ کام نبی اکرم ﷺ کی تعظیم و اکرام میں نہیں کر رہے تھے۔ تب ہی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کو ڈانٹنے لگے تھے اور کنکریاں مارنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے روکنے پر آپ رضی اللہ عنہ رک گئے۔ اگر یہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم والا کام تھا تو کیا (نعوذ باللہ!) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ گستاخ رسول تھے کہ ان کو یہ کام پسند نہ آیا اور اس کو روکنے کے درپے ہو گئے تھے؟

بعض لوگ جہالت اور غلو کی بنیاد پر اس اقدام کو نبی اکرم ﷺ کی تعظیم میں رقص قرار دیتے ہیں، جبکہ محدثین کرام اس کو جنگی مشق قرار دے رہے ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں یہ مشقیں دیکھ رہی تھی، یہاں تک کہ میرا جی بھر گیا اور میں خود ہی وہاں سے چلی گئی۔ (مسند الامام احمد: ۳۳/۶، صحیح بخاری: ۹۴۹، صحیح مسلم: ۸۹۲)

حافظ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی (۵۷۸-۶۵۶ھ) لکھتے ہیں:

وأما لعب الحبشة في المسجد ، فكان لعبا بالحرا وبالدرق تواثبا ورقصا بهما ، وهو من باب التدريب على الحرب والتّمرين والتّشيط عليه ، وهو من قبيل المندوب ، ولذلك أباحه النّبيّ صلى الله عليه وسلم في المسجد .

”رہا حبشی لوگوں کا مسجد میں کھینا تو یہ نیزوں اور ڈھالوں کے ساتھ اچھل کود تھی۔ یہ جنگی تربیت، ٹریننگ اور مشق تھی۔ یہ مستحب کاموں میں سے ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں اس کی اجازت دی تھی“ (المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم للقرطبی: کتاب الجمعة، باب ما یقرأ بہ فی صلاة العیدین)

حاصل یہ ہے کہ جنگی مشق کے دوران ایک مخصوص حرکت اور انداز کو رقص سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ محدثین کرام کی تصریحات سے معلوم ہوا ہے۔

دلیل نمبر ۲): سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أتینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنا وجعفر وزید، فقال لزید: أنت أخونا ومولانا، فحجل، وقال لجعفر: أشبهت خلقی وخلقی، فحجل وراء حجل زید، ثم قال لی: أنت منی وأنا منک، فحجلت وراء حجل جعفر.

”میں، جعفر (بن ابی طالب) اور زید (بن حارثہ) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا، آپ ہمارے بھائی اور دوست ہیں، وہ ناچے۔ آپ ﷺ نے جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، آپ شکل و صورت اور اخلاق میں میرے مشابہ ہیں تو وہ زید کے ناچنے کے پیچھے ناچے، پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا، آپ مجھ سے اور میں آپ سے ہوں، اس پر میں جعفر رضی اللہ عنہ کے ناچنے کے پیچھے ناچا۔“ (مسند الامام احمد: ۱۰۸/۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۶/۸، ۲۲۶/۱)

تبصرہ: اس کی تین سندیں ہیں، ایک مسند احمد میں اور دو بیہقی میں، لیکن یہ سب کی سب ”ضعیف“ ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ والی سند ابواسحاق السبعی کی ”تدلیس“ کی بنا پر ”ضعیف“ ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی دو سندیں پیش کی ہیں۔ پہلی سند (۶۵۱/۸) میں اگرچہ ابواسحاق السبعی نے سماع کی تصریح کی ہے، مگر اس سند کا ایک راوی عبد اللہ بن محمد (بن سعید) بن ابی مریم سخت ”ضعیف“ ہے۔

امام ابن عدی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: عبد اللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم مصری، یحدث عن الفریابی وغیرہ بالباطل ...

”عبد اللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم مصری ہے۔ یہ فریابی وغیرہ سے باطل روایات بیان کرتا ہے۔“

نیز لکھتے ہیں: وعبد اللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم هذا إما أن يكون مغفلاً لا يدري ما يخرج من رأسه أو يتعمد ، فإنني رأيت له غير حديث مما لم أذكره أيضا ها هنا غير محفوظ . ”یہ عبد اللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم راوی یا تو اتنا غیر حاضر دماغ تھا کہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے سر سے کیا نکل رہا ہے یا پھر یہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا تھا، کیونکہ میں نے جو احادیث یہاں ذکر نہیں کیں، ان میں بھی اس کی کئی غیر محفوظ احادیث دیکھی ہیں۔“
(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۲۵۵/۴)

علامہ بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وهو ضعيف جدًا . ”یہ سخت ضعیف راوی ہے۔“ (مجمع الزوائد : ۳۸۹/۲)

اس میں دوسری علت یہ ہے کہ ابواسحاق السبعی ”مختلط“ ہیں، ان سے بیان کرنے والے راوی زکریا بن ابی زائدہ ہیں، جو کہ ان سے اختلاط کے بعد بیان کرتے ہیں۔
اور دوسری سند (۲۶۶/۱۰) میں ان سے اختلاط سے پہلے بیان کرنے والے راوی اسرائیل بن یونس بیان کرتے ہیں، لیکن وہاں ابواسحاق ”عن“ سے بیان کر رہے ہیں اور وہ ”مدلس“ بھی ہیں، لہذا یہ واقعہ تمام سندوں سے مردود ہے۔
والصمد للہ !

حافظ بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) لکھتے ہیں: وفي هذا إن صحّ دلالة على جواز الحجل ، وهو أن يرفع رجلا ويقفز على الأخرى من الفرح ، فالرقص الذي يكون على مثاله يكون مثله في الجواز . ”اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو اس میں حجل کی اجازت ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی خوشی سے ایک ٹانگ اٹھائے اور دوسری پر ناچے، چنانچہ جو رقص اس طرح کا ہوگا، وہ جواز میں اسی کی طرح ہوگا۔“ (السنن الكبرى للبيهقي : ۲۲۶/۱۰)

جب یہ روایت ہی بلحاظ سند ثابت نہیں ہو سکی تو اس کی دلالت بھی خود بخود ختم ہو گئی۔ دوسری بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ حافظ بیہقی رحمہ اللہ بھی اسے صحیح نہ سمجھتے تھے، ورنہ تردّد کا اظہار نہ کرتے۔

دلیل نمبر ۴ : محمد بن علی بن الحسین الباقر رحمہ اللہ (۵۶-۱۱۸ھ) فرماتے ہیں:

إن ابنة حمزة لتطوف بين الرجال إذ أخذ عليّ بيدها ، فألقاها إلى فاطمة في هودجها ، قال : فاختصم فيها عليّ وجعفر وزيد بن حارثة ، حتى ارتفعت أصواتهم ،

فأيقظوا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ من نومه ، قال : هلمّوا ، أقض بينكم فيها وفي غيرها ، فقال عليّ : ابنة عمّي ، وأنا آخر جتها ، وأنا أحقّ بها ، وقال : جعفر : ابنة عمّي وخالتها عندي ، وقال زيد : ابنة أخي ، فقال في كلّ واحد قولاً رضي به ، فقضى بها لجعفر وقال : الخالة الوالدة ، فقام جعفر ، فحجل حول النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، دار عليه ، فقال النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ما هذا ؟ قال : شيء رأيت الحبشة يصنعونه بملوكهم .

سیدنا علیؑ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے سیدہ فاطمہؑ کے ساتھ ہودج میں ڈال دیا۔ پھر اس کے بارے میں سیدنا علیؑ، جعفرؑ اور زید بن حارثہؑ جھگڑ پڑے، یہاں تک کہ ان کی آوازیں اونچی ہو گئیں اور انہوں نے (اپنے شور سے) نبی اکرم ﷺ کو بیدار کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، آؤ میں تمہارے درمیان اس بارے میں اور دوسرے معاملات میں فیصلہ کروں۔ سیدنا علیؑ عرض کرنے لگے کہ یہ میری پچازاد ہے اور میں نے اسے ساتھ لیا ہے اور میں ہی اس کا زیادہ حق دار ہوں۔ سیدنا جعفرؑ کہنے لگے، یہ میری پچازاد ہے اور اس کی خالہ میرے عقد میں ہے۔ سیدنا زیدؑ نے عرض کی، یہ میری بھتیجی ہے۔ آپ ﷺ نے سب کے لیے ایسی بات کہی، جس نے ان سب کو راضی کر دیا، پھر فیصلہ سیدنا جعفرؑ کے حق میں کر کے فرمایا، خالہ والدہ ہی ہے۔ اس پر سیدنا جعفرؑ اٹھے اور نبی اکرم ﷺ کے گرد ناچنے لگے اور چکر لگانے لگے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، یہ کیا ہے؟ سیدنا جعفرؑ نے عرض کی، یہ ایسا کام ہے، جو میں نے جشی لوگوں کو اپنے بادشاہوں کے ساتھ کرتے دیکھا تھا۔“

(طبقات ابن سعد : ۳۵-۳۶، مصنف ابن ابی شیبہ : ۱۷۰/۱۰، مختصر)

تبصرہ :

اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

- ① محمد بن علی الباقرؑ تابعی ہیں اور وہ ڈائریکٹ نبی اکرم ﷺ سے حدیث بیان کر رہے ہیں، لہذا یہ روایت ”مرسل“ ہونے کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔
- ② حفص بن غیاث ”مدلس“ ہیں۔ ثقہ مدلس بخاری و مسلم کے علاوہ ”عن“ سے روایت کرے تو وہ ”ضعیف“ ہوتی ہے۔ اس میں سماع کی تصریح نہیں ہے۔

دلیل نمبر ⑤ : قال محمد بن عمر الواقدي : حدثني ابن أبي

حبیبہ عن داؤد بن الحصین عن عکرمۃ عن ابن عباس ، قال : فلمّا قضیٰ بها لجعفر قام جعفر ، فحجل حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : ما هذا یا جعفر ! قال : یا رسول اللہ ! کان النّجاشیّ إذا أرضیٰ أحدًا قام ، فحجل حوله . ”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حمزہ کی بیٹی کا فیصلہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں کر دیا تو وہ کھڑے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گردنا چنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے جعفر! یہ کیا؟ عرض کی، اے اللہ کے رسول! نجاشی جب کسی کو خوش کرتا تو وہ شخص کھڑا ہوتا اور نجاشی کے گردنا چتا (اسی لیے میں نے ایسا کیا ہے)۔“

(المغازی لمحمد بن عمر الواقدی : ۷۳۸/۲، تاریخ دمشق لابن عساکر : ۳۶۱/۱۹، کنز

العمال : ۱۴۰۳۳)

تبصرہ : یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی محمد بن عمر الواقدی جمہور کے نزدیک ”ضعیف، متروک اور کذاب“ ہے۔

حافظ ابن ملقن رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وقد ضعفہ الجمهور . ”اسے جمہور

نے ضعیف قرار دیا ہوا ہے۔“ (البدر المنیر لابن الملکن : ۳۲۴/۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے ”متروک“ کہا ہے۔ (تقریب التہذیب : ۶۱۷۵)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کتب الواقدی کذب . ”واقدی کی کتابیں جھوٹ

کا پلندہ ہیں۔“ (الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۲۱/۸ ، وسندہ صحیح)

امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لأنّہ عندی ممن یضع الحدیث .

”میرے نزدیک یہ جھوٹی احادیث گھڑنے والا ہے۔“ (الجرح والتعدیل : ۲۱/۸)

امام احمد رحمہ اللہ نے اسے ”کذاب“ قرار دیا ہے۔ (الکامل لابن عدی : ۲۴۱/۶ ، وسندہ حسن)

امام بخاری، امام ابوزرہ، امام نسائی اور امام عقیلی رحمہم اللہ نے اسے ”متروک الحدیث“ کہا ہے، امام یحییٰ بن معین اور جمہور نے ”ضعیف“ کہا ہے۔

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یروی أحادیث غیر محفوظۃ والبلاء منه ، ومتون أخبار الواقدی غیر محفوظۃ ، وهو بین الضّعف . ”یہ غیر محفوظ احادیث

بیان کرتا ہے اور یہ مصیبت اسی کی طرف سے ہے، واقدی کی احادیث کے متون غیر محفوظ ہیں، وہ واضح ضعیف راوی ہے۔“ (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۲۴۳/۶)

② داؤد بن الحصین کی عکرمہ سے روایت کے متعلق امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ماروی عن عکرمۃ فمکر الحدیث . ”جو احادیث یہ عکرمہ سے بیان کرتا ہے، ان میں منکر الحدیث ہوتا ہے۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم : ۴۰۹/۳، وسندہ صحیح)

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وأما الحجل فهو نوع من المشى يفعل عند الفرح ، فأين هو من الرقص ؟ ”حجل ایک قسم کی چال ہے، جو خوشی کے وقت چلی جاتی ہے، اس کا رقص سے کیا تعلق؟“ (تلبیس ابلیس لابن الجوزی : ۲۳۰/۱)

دلیل نمبر ⑥ : سیدنا جابر بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے روایت ہے:

”جب سیدنا جعفر بن ابی طالب رحمہ اللہ حبشہ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا استقبال کیا۔ جب سیدنا جعفر رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ناپچنے لگے، یعنی اپنی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی تعظیم میں ایک ٹانگ پر چلنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔“ (دلائل النبوة للبيهقي : ۲۴۶/۴، ح : ۱۵۹۶)

تبصرہ : یہ روایت جھوٹ کا پلندا ہے، کیونکہ:

① امام بیہقی رحمہ اللہ اس کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: فی إسناده إلى الثوري من لا يعرف . ”اس حدیث کی سفیان ثوری کی طرف سند میں ایک مجہول راوی ہے۔“

② امام سفیان ثوری ”مدلس“ ہیں اور سماع کی صراحت نہیں کی۔

③ ابوالزبیر بھی ”مدلس“ ہیں اور ”عن“ کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، جو کہ ”مدلس“ سے بخاری و مسلم کے علاوہ قبول نہیں ہوتا۔

نوٹ : بنتِ حمزہ کا واقعہ صحیح بخاری (۲۶۹۹ وغیرہ) میں بھی موجود ہے، لیکن وہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناپچنے کا کوئی ذکر نہیں، لہذا ان روایات پر ضعف کا جو حکم لگایا گیا ہے، وہ ناپچ والے سیاق کے متعلق ہے۔

الحاصل : رقص ممنوع و حرام ہے، اس کے جواز پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔

حافظ ابو یحییٰ نور پوری



صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہیہ انکار حدیث

قرآن حدیث

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ...

کے محل نزول و روز نزول کے متعلق حدیث (۲)

عقلی اعتراضات

اعتراض نمبر ① : ”پھر ابو العیسیٰ اور مسعر کی روایت بتاتی ہے کہ حضرت عمر

سے یہ بات کہنے والا ایک یہودی تھا اور ثوری کی روایت میں ہے کہ متعدد یہودی لوگ تھے۔
ادریس بن یزید کی روایت میں بھی بصیغہ جمع یہود کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف قیس بن مسلم کی جہت سے ہے
اور نہیں کہا جاسکتا کہ دراصل طارق نے کیا ذکر کیا تھا، ایک یہودی کا یا چند یہودیوں کا؟ قیس نے کبھی
کچھ کہہ دیا، کبھی کچھ۔“ (”صحیح بخاری کا مطالعہ“ : ۵۵/۱)

جواب : قارئین کرام! جب اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے اور میرٹھی صاحب کے اس
پر کیے گئے تمام اصولی اعتراضات کو ہم نے ان کی بے اصولی ثابت کر دیا ہے تو اب اس پر عقلی
اعتراضات کچھ حیثیت نہیں رکھتے، کیونکہ قرآن کریم، جس کی صحت میں کسی مسلمان کو ادنیٰ سا بھی شبہ
نہیں، عقلی اعتراضات تو اس میں بھی منکرین نے کر دیئے ہیں اور کتنے ہی مقامات پر انہوں نے بزعیم
خود قرآن کریم میں تناقض اور اختلاف ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن
مجید کی صحت میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکا۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں :

روزِ قیامت کے بارے میں قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا ہے : ﴿كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (السجدة : ۵/۳۲) یعنی اس کی مقدار ایک ہزار سال ہوگی، جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا :

﴿كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج : ۴/۷۰) ، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔

جس طرح شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے حدیث نبوی پر اعتراض کیا ہے، اگر بعینہ یہ اعتراض
کوئی منکر قرآن، قرآن کریم پر کر دے اور کہہ دے کہ : (نقل کفر، کفر نہ باشد!)

”سورہ سجدہ بتاتی ہے کہ روزِ قیامت کی مقدار ہزار سال ہوگی، جبکہ سورہ معارج میں پچاس ہزار

سال کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف صحابہ کرام کی جہت سے ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ دراصل رسول اللہ ﷺ کے پاس کیا وحی آئی تھی، ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال؟ صحابہ کرام نے کبھی کچھ کہہ دیا، کبھی کچھ۔۔۔“ تو اس کفریہ اعتراض کا میرٹھی کمپنی کے پاس کیا جواب ہوگا؟ اگر وہ یہاں جمع و تطبیق کی کوئی صورت نکالیں گے تو حدیث میں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے؟ نبی اکرم ﷺ تو دینی معاملات میں اپنی خواہش سے بولتے ہی نہ تھے۔ (النجم: ۵۳-۴)

قارئین کرام اللہ کے لیے غور کریں اور بتائیں کہ کیا قرآن پاک پر اس بے وقوفانہ اعتراض سے اس کتاب ذی شان کی صحت میں ذرا برابر بھی کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے؟ یقیناً ہر مسلمان کا جواب ہاں میں ہوگا! پھر خود ہی غور کر لیں کہ حدیث پر اس طرح کے اعتراضات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

سیدھی سی بات ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ بات تو ایک ہی یہودی نے کی تھی، لیکن اس ایک یہودی کی یہ بات سب یہودی نمائندگی تھی، یعنی اس نے تمام یہودی کی طرف سے یہ بات پیش کی تھی اور انہی سا شعور رکھنے والا آدمی بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ کسی قوم کا نمائندہ اگر کوئی بات کرتا ہے تو وہ ساری قوم کی بات شمار ہوتی ہے اور اسے پوری قوم کی بات قرار دیا جاتا ہے۔

اتنی سی بات بھی جس آدمی کی عقل میں نہیں ساسکی، وہ لگا ہے پوری امت کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے!!!

اعتراض نمبر ۲): ”رہا اس حدیث کا مضمون، جسے طارق بن

شہاب و قبیسہ بن ذؤیب اور محمد بن کعب القرظی نے حضرت عمر اور یہودی کے مکالمہ کے طور پر اور عمار بن ابی عمار نے حضرت ابن عباس اور یہودی کے مکالمہ کے طور پر نقل کیا ہے تو یہ سراسر باطل اور اس المناک حقیقت کی دلیل ہے کہ ان راویوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ کو اس کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ کرنے اور اس آیت کو سمجھنے کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا، جس میں یہ ارشاد مذکور ہے۔

یہ ارشاد کوئی مستقل آیت نہیں ہے، بلکہ ایک آیت کے درمیان کا ٹکڑا ہے۔۔۔ سورہ مائدہ کے نزول کا آغاز سن ۷ ہجری میں عمرہ القضاء سے پہلے ہوا تھا۔ اس کے آغاز میں اہل ایمان کو خطاب کر کے ان معاہدوں کو وفا کرنے کا حکم دیا ہے، جو حضور اکرم ﷺ نے مختلف قبل عرب سے کیے تھے،

خصوصاً ناجنکی کا وہ دس سالہ معاہدہ، جو سن ۶ ہجری میں بمقام حدیبیہ مشرکین مکہ سے ان ہی کی پیش کردہ شرائط پر منعقد فرمایا تھا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ فتح خیبر کے بعد محمد اللہ مسلمانوں کو زبردست قوت و شوکت حاصل ہو چکی تھی اور ممکن تھا کہ اس قوت و شوکت کے پیش نظر مسلمانوں کو یہ خیال ہونے لگے کہ وہ معاہدے اس وقت کے ہیں، جب ہم اتنے قوی و زور آور نہ تھے۔ اب کیا ضرورت ہے کہ ہم ان سیاسی مصلحتوں پر مبنی معاہدوں کا لحاظ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اس متوقع وسوسہ کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا۔۔۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۵۸/۱-۵۹)

جواب: قارئین کرام! ہم نے، بلکہ پوری امت مسلمہ نے جس روایت کی بنا پر اس آیت کریمہ کا محل نزول مقام عرفہ قرار دیا ہے، سب مسلمانوں کے برعکس اس کی صحت پر تو میرٹھی صاحب کو اعتراض ہے، لیکن افسوس ہے کہ میرٹھی صاحب نے اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ یہ آیت کریمہ سن ۷ ہجری میں عمرہ القضاء سے پہلے نازل ہوئی۔ منکرین حدیث کو چاہیے کہ ذرا اس پر ”بے غبار“ نہ سہی کوئی ”غبار دار“ سند ہی پیش کر دیں!!!

آخر میرٹھی صاحب نے کونسا کشف لگایا ہے کہ اجماع امت کے خلاف بغیر دلیل کے ان کو ۷ ہجری میں اس کا نزول نظر آ گیا ہے؟ حالانکہ منکرین حدیث کسی ایک مسلمان مفسر سے بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ اس نے عمرہ القضاء سے پہلے سورہ مائدہ کے نزول کا دعویٰ کیا ہو، اس کے برعکس اس طرح کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وروی أنّہا نزلت منصرف رسول اللہ من الحديبية ، وذكر النقاس عن أبي سلمة ... قال ابن العربي : هذا حديث موضوع ، لا يحل لمسلم اعتقاده ...

”ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ سورت رسول اللہ ﷺ کے حدیبیہ سے واپس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ نقاش نے ابوسلمہ سے ذکر کیا ہے۔۔۔ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ”موضوع“ (من گھڑت) ہے۔ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اس (کی صحت) کا اعتقاد رکھے۔“ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۳۰/۶)

مفسر ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں: وهذا عندی لا يشبه كلام النبي صلى الله عليه وسلم ، ومن هذه السورة ما نزل في حجة الوداع ، ومنها ما نزل عام الفتح ...

”میرے نزدیک یہ (من گھڑت روایت) نبی کریم ﷺ کی کلام مبارک سے ملتی جلتی بھی نہیں۔ (بلکہ اس کے برعکس) اس سورت کا بعض حصہ حجۃ الوداع میں نازل ہوا اور بعض حصہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا تھا۔۔۔“ (المحرر الوجیز لابن عطیة: ۱۶۷/۲)

لیجیے! یہ ہے انکارِ حدیث کا انجام بے خیر کہ امت کے اتفاقی فیصلہ صحت کو چھوڑا اور ہاتھ میں وہ روایت آئی، جسے ائمہ مسلمین من گھڑت اور خود ساختہ قرار دے رہے ہیں اور جس کے الفاظ ہی ایسے ہیں کہ وہ رسول کریم ﷺ کی فصیح و بلیغ زبان سے ادا ہونا ہی ممکن نہیں ہیں۔

پھر میرٹھی صاحب کا یہ قول بھی بالکل باطل ہے کہ اس سورت کے آغاز میں ان معاہدوں کو وفا کرنے کا حکم ہے، جو مسلمانوں نے مختلف قبائل عرب سے کیے تھے، خصوصاً معاہدہ حدیبیہ، حالانکہ کسی مفسر نے اس سورت کے شانِ نزول کے بیان میں معاہدہ حدیبیہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ بات چودہ سو سال بعد صرف میرٹھی صاحب کو سوجھی ہے۔ اس کے برعکس اس سورت کے شروع میں جن ”عقود“ کو نبھانے اور وفا کرنے کا ذکر ہے، ان کے بارے میں امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَأُولَى الْأَقْوَالِ عِنْدَنَا بِالصَّوَابِ ... وَأَنَّ مَعْنَاهُ أَوْفُوا - يَا أَيُّهَا الَّذِينَ - بِعَقُودِ اللَّهِ الَّتِي أَوْجَبَهَا عَلَيْكُمْ ، وَعَقْدُهَا فِيمَا أَحَلَّ لَكُمْ وَحَرَّمَ عَلَيْكُمْ ، وَالزَّمَمُ فَرْضُهُ ، وَبَيْنَ لَكُمْ حَدُودُهُ ، وَأَنَّمَا قُلْنَا ذَلِكَ أُولَى بِالصَّوَابِ مِنْ غَيْرِهِ مِنَ الْأَقْوَالِ ، لِأَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ اتَّبَعَ ذَلِكَ الْبَيَانَ عَمَّا أَحَلَّ لِعِبَادِهِ وَحَرَّمَ عَلَيْهِمْ ، وَمَا أَوْجَبَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَرَائِضِهِ ، فَكَانَ مَعْلُومًا بِذَلِكَ أَنَّ قَوْلَهُ : ﴿ أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ﴾ أَمْرٌ مِنْهُ عِبَادَهُ بِالْعَمَلِ بِمَا أَلْزَمَهُمْ مِنْ فَرَائِضِهِ وَعَقُودِهِ عَقِيبَ ذَلِكَ ، وَنَهَى مِنْهُ لَهُمْ عَنْ نَقْضِ مَا عَقَدَهُ عَلَيْهِمْ مِنْهُ ... ”سب اقوال میں سے ہمارے نزدیک رائج یہ ہے۔۔۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ اے ایمان والو! وہ عقود نبھاؤ، جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیے ہیں، حلت و حرمت میں جو قیود تم پر لگائی ہیں، جو فرض تم پر عائد کیے ہیں اور جو حدود تمہارے لیے بیان کی ہیں۔ ہم نے اسے دوسرے اقوال کی نسبت قرین صواب اس لیے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد اپنے بندوں پر حلال و حرام کی کئی چیزیں بیان کی ہیں اور اپنے عائد کیے ہوئے فرائض ذکر کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ﴾ (اے ایمان والو! تم اپنے عہدوں کو نبھاؤ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں

کو حکم ہے کہ وہ اس کے ان فرائض و عقود کو پورا کریں جو اس حکم کے فوراً بعد بیان ہوئے ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے اپنے مقرر کیے ہوئے فرائض کو پامال کرنے کی ممانعت ہے۔۔۔“ (تفسیر الطبری: ۴۵۴/۹)

میرٹھی صاحب جو ”سیاق و سباق“ کی بہت رٹ لگاتے ہیں، ان کو امام طبری رحمہ اللہ کا بیان کردہ یہ فی الواقع سیاق و سباق سمجھ نہیں آیا کہ عقود کو پورا کرنے کا جو حکم اس سورت کے شروع میں دیا گیا ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض کی پابندی ہے، کیونکہ ساتھ ہی تو حلت و حرمت کا ذکر آ رہا ہے۔

ائمہ حدیث پر سیاق و سباق کو نہ سمجھ سکنے کا الزام رکھنے والے میرٹھی صاحب کی اپنی عقل یہاں پر بالکل سٹھیا گئی ہے اور مفسرین کا بیان کردہ سیاق و سباق بھی ان کے خانہ عقل میں نہیں سما سکا اور انہوں نے ایسی بے بنیاد بات کہہ دی ہے، جو آج تک کسی مسلمان مفسر نے نہیں کہی، بلکہ ایسا کہنا ان کے نزدیک جائز ہی نہیں، جیسا کہ ہم مفسر ابن عطیہ کے بقول ذکر کر چکے ہیں!!!

قارئین کرام! آپ دیکھ چکے ہیں کہ مفسرین کرام کے مطابق اس سورت کا کچھ حصہ حجتہ الوداع کے موقع پر اور کچھ حصہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا، لیکن لغت عرب، قرآن کریم اور علم حدیث و تفسیر سے بالکل عاری اور تمام سلف صالحین کی مخالفت کرنے والے شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سورت عمرہ القضاء سے پہلے ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ اب فیصلہ آپ پر ہے کہ آپ کس کی بات مانیں گے؟

اعتراض نمبر ③: ”یہ تیسری آیت ہے، اسی کے ضمن میں اپنی یہ نعمت یاد دلائی کہ مشرکین کو دین اسلام سے سرسبز نہ ہو سکنے کی جو آس لگی ہوئی تھی، اپنا دم توڑ چکی ہے اور اصول و فروع کے لحاظ سے تمہارا دین اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح تم پر اللہ کا یہ انعام پورا ہو چکا ہے۔ اب تمہیں اس پورے دین کے تحت زندگی گزارنا اور ہمیشہ اپنے رب کا فرمانبردار رہنا ہے۔ یہ ہی روش تمہارے لیے پسندیدہ ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد مضمون بالا کا تتمہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ جانور، جن کا گوشت کھانا تمہیں حرام ہے، حالت اضطرار میں بقدر ضرورت ان کا گوشت تناول کر لینے کی رخصت ہے۔۔۔ یہ ہم نقل آیات ایک ہی سلسلہ کی ہیں اور ان کا نزول اس وقت ہوا ہے، جب رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ القضاء کے لیے تشریف لے جانے والے تھے۔ جب حقیقت یہ ہے تو اس بے ہودہ بکواس کی کیا تک ہے کہ ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ کا نزول سن ۱۰ ہجری میں نویس ذی الحجہ کو عرفات میں ہوا تھا۔ طارق بن شہاب و قبیصہ بن ذؤیب و محمد بن کعب قرظی کی

ذکر کردہ کہانی بھی قطعاً غلط ہے اور عمار بن ابی عمار کی بیان کردہ کہانی بھی باطل ہے۔ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی تھی نہ حضرت ابن عباس نے۔ ان یا وہ گورایوں نے نہ معلوم کس سے سنی ہوئی یہ غلط کہانی تو روایت کر ڈالی اور یہ نہ سوچا کہ اس سے لازم آتا ہے کہ تقریباً تین سال تک مسلمان اس آیت کو ناقص پڑھتے رہے ہوں۔۔۔ کیونکہ ان راویوں کے بقول ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ کا نزول ہوا ہی نہ تھا اور اسی ناقص طور سے لکھنے والوں نے یہ آیت لکھی ہو، پھر نویں ذی الحجہ کو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا ہو کہ اس آیت کے درمیان میں یہ اضافہ کر لو اور ایسا ہوا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا، حالانکہ صحیح تو کیا، کسی ضعیف روایت میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ نہ ہی ان راویوں نے یہ سوچا کہ اس آیت میں ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ سے پہلے متصل ﴿الْيَوْمَ يَئْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ﴾ آیا ہے اور دونوں آیات ہم نسق ہیں۔ جب ارشادِ اوّل، یعنی ﴿الْيَوْمَ يَئْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ﴾ سن ۷ ہجری میں نازل ہوا ہے تو ارشادِ ثانی، یعنی ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ کو سن ۱۰ ہجری میں نازل شدہ قرار دینے کی کیا تگ ہے؟“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۵۹/۱-۶۱)

جواب : ① قارئین کرام ذرا میری صاحب کی دوغلی پالیسی ملاحظہ فرمائیں کہ سلف صالحین کے خلاف اپنی بے بنی تفسیر کو ”جملہ معترضہ“ کا سہارا دے کر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن سب امت کی طرف سے کی گئی اتفاقی تفسیر میں ان کو اکثر یہی عیب نظر آیا ہے اس سے ہم نسق آیات میں کوئی ربط نہیں رہتا!

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں تھی
حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ عقود کو پورا کرنے کا حکم دینے کے بعد حلت و حرمت کا ذکر جملہ معترضہ نہیں، بلکہ پچھلی بات کا ہی تسلسل ہے، یعنی جن عقود کی ایفاء کا حکم تھا، اب انہی کو بیان کیا جا رہا ہے۔
مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: **إِعلم أنه تعالى لما قرر**
بالآية الأولى على جميع المكلفين أنه يلزمهم الانقياد لجميع تكاليف الله تعالى،
وذلك كالأصل الكلّي والقاعدة الجميلة، شرع بعد ذلك في ذكر التكاليف
المفصلة، فبدأ بذكر ما يحل وما يحرم من المطعومات، فقال: ﴿أَحَلَّتْ لَكُمْ

”جان لیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت کے پہلے ٹکڑے (المائدة: ۱۰۵)

کے ساتھ تمام مکلفین پر ایک کلی اصول اور بہترین قاعدے کے ذریعے اپنے تمام احکام تکلیفیہ کی پیروی لازم کی تو اب ان احکام تکلیفیہ کی تفصیل بیان کرنا شروع کی ہے۔ ابتدا کھانے کی چیزوں میں سے حلال و حرام کے ذکر سے کی ہے، لہذا فرمایا: ﴿أَحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدة: ۱۰۵)

(تمہارے لیے چوپائے حلال کر دیئے گئے ہیں)۔“ (التفسیر الکبیر للرازی: ۹۹/۱۱)

علامہ آلوسی (۱۲۷۰ھ) بھی لکھتے ہیں: ﴿أَحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدة: ۱۰۵)

شروع فی تفصیل الأحکام الّتی أمر بوفائها، وبدأ سبحانه بذلك، لأنّه

يتعلّق بضروریات المعاش ... ﴿أَحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدة: ۱۰۵)

(تمہارے لیے چوپائے حلال کر دیئے گئے ہیں) یہ ان احکام کی تفصیل کی ابتدا ہے، جن کے

ایفاء کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ابتدا اس لیے کی ہے کہ یہ معاشی ضروریات کے متعلق

ہے۔“ (روح المعانی للآلوسی: ۴۹/۶)

معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے امت مسلمہ کی متفقہ تفسیر کو سینے سے لگایا ہے، ان کو ”جملہ معترضہ“

کہہ کر جان چھڑانے کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ ان کے نزدیک یہ الفاظ آیت کے پہلے ٹکڑے سے

بالکل ہم ربط ہیں۔ اب کوئی میرٹھی صاحب کے معتقدین سے پوچھے کہ کیا اس آیت میں

ان کو ایک ہی آیت کے دو ٹکڑوں کی بے ربطی نظر نہیں آئی؟ کیا وہ اب بھی امت مسلمہ کی اتفاقی تفسیر

کے خلاف میرٹھی صاحب کی اس یا وہ گوئی اور بے ہودہ بکواس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

⑤ ہم گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا وقت عمرۃ القضاء

سے پہلے ہونے کا دعویٰ کرنا زری خود سری اور علم تفسیر سے جہالت کا نتیجہ ہے۔ کسی ایک مسلمان مفسر

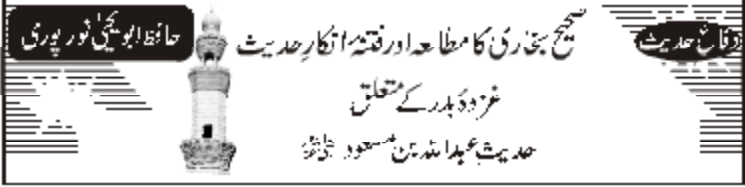
نے چودہ سو سال کے عرصہ میں آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا، نہ ہی میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین کے

پاس اس بات پر کوئی دلیل ہے، لہذا آیات کے ہم نق ہونے کو بنیاد بنا کر صحیح بخاری پر یہ اعتراض اور

راویان حدیث، خصوصاً صحابی رسول سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ یا وہ گوئی بالکل فضول ہے

کہ انہوں نے قرآن کریم کو نہ سمجھا تھا۔ یہ تو خود منکرین حدیث کی اپنی بے عقلی اور علم قرآن سے دُوری

ہے کہ آیات قرآنیہ کا صحیح وقت نزول اور صحیح تفسیر ان کی سمجھ میں نہیں آسکی۔



قارئین کرام! سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی رسول ہیں، جو کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بدر، احد اور خندق سمیت تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری کے اندر ان کی شان میں ایک حدیث موجود ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

شهدت من المقداد مشهدا ، لأن أكون صاحبه أحب إلي مما عدل به ، أتى النبي صلى الله عليه وسلم ، وهو يدعوا على المشركين ، فقال : لا نقول كما قال قوم موسى : ﴿ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ﴾ (المائدة : ٢٤/٥) ، ولكننا نقاتل عن يمينك وعن شمالك وبين أيديك وخلفك ، فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم أشرق وجهه وسرّ ، يعني : قوله . ”میں نے مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا وہ (رشتہ انگیز) مقام دیکھا ہے کہ میرا اس مقام والا ہونا مجھے اس کے برابر والے ہر عمل سے محبوب ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ (غزوہ بدر والے دن) نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ مشرکین کے خلاف بددعا کر رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا، ہم اس طرح نہیں کہیں گے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ﴾ (المائدة : ٢٤/٥) (آپ اور آپ کا رب جاؤ اور لڑائی کرو)، بلکہ ہم تو آپ کے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے لڑیں گے۔ (سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ) میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ کا چہرہ مبارک چمک اٹھا اور اس بات نے آپ ﷺ کو خوش کر دیا۔“

(صحیح بخاری : ٣٩٥٢)

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صریح گستاخی کرنے والے ناعاقبت اندیشوں کو صحابہ کرام کی یہ منقبت کیسے ہضم ہو؟ انہوں نے اس پر اعتراض کی ٹھان لی ہے۔

آئیے امت کے اس اتفاقی فیصلے پر میرٹھی صاحب کی طرف سے کیے گئے فضول اعتراض کا جائزہ لیتے ہوئے فیصلہ کریں کہ حق پر کون ہے، پوری امت مسلمہ یا میرٹھی صاحب؟

اعتراض : ”یہ حدیث روایت کر کے طارق بن شہاب نے حضرت مقداد بن



اسود رضی اللہ عنہ کی منقبت بیان کی تھی، لیکن حضرت مقداد کی جلالت قدر اس جھوٹی منقبت کی محتاج نہ تھی۔ میں اسے جھوٹی منقبت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ ۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ میں ذکر فرمایا ہے۔ اسی سے حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو اور بعد کے مسلمانوں کو یہ واقعہ معلوم ہوا ہے اور بلاشبہ سورہ المائدہ جنگ بدر کے تقریباً ۵ برس بعد نازل ہوئی ہے۔ پھر ۲ ہجری میں مقداد ابن اسود کو قرآن کا بیان فرمودہ قصہ قرآن کے الفاظ میں کیسے معلوم ہو سکتا تھا اور وہ اپنی اور مسلمانوں کی وفاداری و جاں نثاری کا ذکر کرتے ہوئے اس قصہ کا حوالہ کیسے دے سکتے تھے اور یقیناً یہ غلط بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نہیں کہی۔ یہ طارق بن شہاب کی ہی دروغ بانی ہے اور سخت حیرت و افسوس ہے کہ امام بخاری تک بھی کسی راوی نے اس پر غور نہیں کیا اور امام بخاری نے بھی اس جھوٹی روایت کو درج صحیح کر دیا۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۶۲/۱ : ۶۳)

جواب : قارئین کرام! میری صاحب نے حدیث کا ترجمہ کرتے وقت خیانت علمی سے

کام لیتے ہوئے اپنی طرف سے ”بدر کے دن“ کے الفاظ بڑھادیئے ہیں، حالانکہ:

① صحیح بخاری کی اس حدیث میں اس طرح کا کوئی لفظ قطعاً موجود نہیں، نہ ہی اس واقعہ کے وقوع کو غزوہ بدر سے پہلے قرار دینا صحیح ہے، بلکہ یہ تو غزوہ بدر کے بہت بعد سورہ مائدہ کے نزول کے بعد کا واقعہ ہے، لہذا اسے خواہ مخواہ غزوہ بدر کے دوران کا واقعہ گردان کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا بہت بڑی تلبیس اور بہت بڑا دھوکا ہے۔

مسند احمد (۳۱۴/۱) اور السنن الکبریٰ للنسائی (۱۱۴۰)، تاریخ دمشق (۱۶۰/۱۶۰) والی روایت میں اس واقعہ کا ذکر غزوہ بدر کے دوران کیا گیا ہے، لیکن یہ روایت تمام سندوں میں امام سفیان کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، کہیں بھی سماع کی تصریح نہیں مل سکی۔

طبقات ابن سعد (۱۴/۲) والی روایت کی کئی سندیں ہیں، جن میں ایک سند میں امام ابن سعد کا استاذ محمد بن عمر الواقدي ہے، جو کہ مشہور و معروف ”کذاب“ اور ”مترک“ ہے۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تو شاید دوسری سندوں کی تحقیق کی جاتی، لیکن اس سے بھی سنگین صورت حال یہ ہے کہ امام ابن سعد رضی اللہ عنہ نے یہ صراحت کر دی ہے کہ ان سب راویوں کی حدیثیں آپس میں مل گئی ہیں۔ (۵/۲)

اب اگر دوسری سندیں صحیح ثابت بھی ہو جائیں تو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہماری مطلوبہ بات واقدی



”کذاب“ والی سند سے ہے یا دوسری اسانید سے، لہذا اس سے اس واقعہ کے غزوہ بدر میں ہونے پر استدلال کرنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں بھی جنگ بدر کے بیان کے ساتھ سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی نہیں کہ انہوں نے کہا ہو: ﴿إِذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا﴾ (المائدة: ۲۴/۵) (آپ اور آپ کا رب جاؤ اور لڑائی کرو)، بلکہ وہاں پر غزوہ بدر کے تذکرہ میں یہ الفاظ مروی ہیں: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ! لَوْ سَرَتْ بِنَا إِلَى بَرَكِ الْغَمَادِ لَسَرْنَا مَعَكَ حَتَّى نَنْتَهِيَ إِلَيْهِ ... ”اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے! اگر آپ ہمیں برک الغماد مقام تک لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ چلتے رہیں گے حتیٰ کہ وہاں پہنچ جائیں۔“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: ۱/۲۷۱) اس بارے میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی مسند احمد (۱۰۵/۳، ۱۸۸)، سنن نسائی (۴۳۴۸، ۸۵۸۰، ۱۱۱۴۱)، ابن حبان (۴۷۲۱) وغیرہم والی اسی معنی والی حدیث کی سند حمید الطویل کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

اسی طرح تفسیر ابن ابی حاتم (۱۶۵۹/۶) کی اس معنی والی حدیث ابی ایوب کی سند عبد اللہ بن لہیعہ کے ”ضعف“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

الحاصل جو سندیں اس واقعہ کے غزوہ بدر کے موقع پر ہونے کے بارے میں صحیح ثابت ہیں، مثلاً صحیح بخاری (۳۹۵۲)، مسند احمد (۲۱۹/۳، ۲۲۰، ۲۵۸)، ابن حبان (۴۷۲۲)، تاریخ دمشق (۱۵۹/۶۰) وغیرہم میں سے کسی میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں، جن کی بنا پر میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح حدیث پر ایک بالکل غیر صحیح اعتراض کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ غزوہ بدر میں بھی سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے اپنے جذبے کا اظہار کیا تھا، لیکن ان الفاظ سے نہیں، کیونکہ اس وقت اس آیت کا نزول ہی نہ ہوا تھا، البتہ دوبارہ کسی موقع پر جب جذبہ جہاد کا اظہار سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کیا، اس میں یہ الفاظ موجود ہیں، کیونکہ اس وقت ان کا نزول ہو چکا تھا۔ واللہ اعلم!

⑤ ہو سکتا ہو کہ میرٹھی صاحب کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس حدیث کو باب غزوة البدر کے متصل بعد ذکر کرنے سے شبہ ہو گیا ہو کہ شاید امام بخاری نے اس حدیث کو غزوہ بدر کے متعلق سمجھا



ہے، لیکن یہ بات درست نہیں، کیونکہ امام موصوف نے اس حدیث کو ایک مستقل باب کے تحت ذکر کیا ہے، نہ کہ باب غزوۃ بدر کے تحت۔

یوں میرٹھی صاحب کا اسے غزوۃ بدر کا واقعہ قرار دے کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا خود ان کی کم علمی و کج فہمی ہے۔ کاش پوری امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے کو چیلنج کرنے کے لیے میرٹھی صاحب تھوڑی سی ہی تحقیق سے کام لے لیتے!

③ ہم پچھل حدیث کے دفاع میں بالنتفیل یہ ذکر کر چکے ہیں کہ سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ صحابی رسول ہیں، لہذا اس صحابی رسول کو بار بار ”دروغ باف“ کہہ کر ان کی گستاخی کی ہے اور اس ارتکاب سے میرٹھی صاحب نے اپنی عقبی گنوانے کے سوا کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔

④ میرٹھی صاحب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے راویان حدیث پر افسوس کر رہے ہیں تو درحقیقت ”چور بھی کہے چور چور“ کے مصداق بنے ہیں۔ اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو ان کی عقل پر انتہائی افسوس کرنا چاہیے کہ انہوں نے اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحابہ کرام اور ثقہ و معتبر محدثین کرام پر ناحق زبان درازی کر کے اپنے ہی ایمان کا نقصان کر لیا ہے۔

⑤ اب تو قارئین کرام، خصوصاً شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کے معتقدین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس حدیث کو ”جھوٹی روایت“ کہنا خود میرٹھی صاحب کا بدترین جھوٹ ہے۔ ہمارے اس منصفانہ تجزیہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ امت مسلمہ کے اتفاق کو ٹھکرانے والا شخص لاکھ دعووں کے باوجود جاہل اور کج فہم ہی ہوتا ہے، کیونکہ عقل مندی اجماع امت کو تسلیم کر لینے میں ہی تو ہے۔



اعتماد

- ① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت پر نماز جنازہ پڑھائی، اس پر چار تکبیریں کہیں اور پھر ایک ہی سلام پھیرا۔“ (سنن الدارقطنی: ۱۷۱/۲، ح: ۱۷۹۹) السنۃ، شمارہ نمبر ⑤، صفحہ نمبر ۲۳ پر یہ حدیث درج ہے، لیکن اس کی سند حفص بن غیاث کی تدلیس کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔ ② السنۃ، شمارہ نمبر ⑤، صفحہ نمبر ۵ پر حافظ نووی کا قول عبداللہ بن عبداللہ کے متعلق لکھا گیا ہے، جبکہ وہ اسماعیل بن ابی اویس کے بارے میں ہے۔

حافظ ابو یحییٰ نور پوری



صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہ انکار حدیث

فہرست حدیث

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت

میں حدیث براہ من عازب بن ہشام

قارئین کرام! آپ گزشتہ اوراق، خصوصاً سابقہ حدیث کے مطالعہ سے بخوبی یہ جان چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی میرٹھی صاحب کی مرغوب عادت ہے، جسے وہ بہانے بہانے سے پورا کرتے رہتے ہیں۔ بات یہیں نہیں رکتی، بلکہ اگر کوئی روایت کسی صحابی کی شان بیان کر رہی ہو تو ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے ہیں اور وہ اس میں کوئی اعتراض کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ صحیح بخاری کی زیر بحث حدیث میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں:

① صلح حدیبیہ کا قصہ

② رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے واپسی کے وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا چچا بچا پکارتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے لگنا اور پھر اس کی کفالت میں اختلاف کا پورا واقعہ۔

③ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا آپ ﷺ سے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کے بارے میں رائے معلوم کرنا اور آپ ﷺ کا رضاعی بہن کہہ کر اس نکاح سے انکار کر دینا۔

بات یہیں تک ہوتی تو شاید منکرین حدیث کو بھاجاتی، لیکن ہوا یوں کہ اس حدیث میں تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت و منقبت بیان ہوئی ہے۔

✽ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَنْتَ مَنِّي وَأَنَا مِنْكَ .

”آپ مجھ سے اور میں آپ سے ہوں۔“

✽ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے یوں اظہار تعلق فرمایا: أَشْبَهْتَ خُلُقِي وَخُلُقِي .

”آپ سیرت و صورت میں مجھ سے مشابہ ہیں۔“

✽ اور سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: أَنْتَ أَخُونَا وَمَوْلَانَا .

”آپ ہمارے بھائی اور مولیٰ ہیں۔“

میرٹھی صاحب کے عنوان سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس حدیث پر اعتراض کی وجہ یہی ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت و منقبت کا بیان ہے اور وہ اس سے ان کو بہت چڑ ہے۔

آئیے ان کے اس متفق علیہ صحیح حدیث پر کیے گئے اعتراضات کی علمی حیثیت معلوم کریں!

اعتراض نمبر ① : ”اس حدیث پر کلام کرنے سے پہلے میں عبید اللہ بن

موسیٰ عسی کا تعارف کر دینا چاہتا ہوں، جس سے امام بخاری نے یہ حدیث سنی تھی۔ عبید اللہ بن موسیٰ عسی کثیر الحدیث شخص تھا۔ کثرتِ احادیث کی بنا پر اس کا شمار حافظانِ حدیث میں ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے اور چند روز اس سے ملاقات کے لیے آنے والوں پر اس کے علم اور زہد و عبادت اور تقشف کا بڑا گہرا اثر پڑتا تھا اور وہ اس کے عقیدت مند بن جاتے تھے، لیکن شیعہ فکر و نظر کا حامل اور اس میں غلو و کج روی میں مبتلا تھا۔ یعقوب بن سفیان نے اس کے متعلق کہا ہے: شیعہ، وإن قال قائل:

رافض، لم أنکر علیہ، وهو منکر الحدیث۔ (وہ شیعہ ہے اور اگر کوئی اسے رافضی بتائے تو میں اس کی تردید نہ کروں گا اور وہ غلط بیان شخص ہے)۔ ابواسحاق جوزجانی کا قول ہے، عبید اللہ بن موسیٰ أغلی وأسوأ مذہباً وأروى للعجائب۔ (عبید اللہ مسلک کے لحاظ سے بہت برا اور غلو کا راور عجیب، یعنی غیر معقول روایات کو کثرت سے بیان کرنے والا ہے)، حافظ ابو مسلم بغدادی نے کہا ہے عبید اللہ بن موسیٰ من المتروکین، ترکہ أحمد لتشیعہ۔ (عبید اللہ ان راویوں میں سے ہے، جن کی بیان کردہ حدیثوں کو اہل حق نے بیان کرنا چھوڑ دیا ہے، امام احمد نے اس کے غالی شیعہ، یعنی رافضی ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا ہے، یعنی اس کی روایات کو ناقابل قبول قرار دے دیا تھا)۔ ساجی کی تحقیق یہ ہے، عبید اللہ صدوق، کان یفرط فی التشیع۔

امام بخاری اور اوائل طلب میں اس کے پاس گئے اور اس سے حدیثیں سنی اور یاد کی تھیں۔ اس کے زہد و تعبد اور کثرتِ روایات سے بخاری بھی فریب کھا گئے۔ یہ حدیث عبید اللہ بن موسیٰ نے بخاری کو ایسی تلخیص اور عیاری کے ساتھ سنائی تھی کہ بخاری اسے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث صحیح گمان کر بیٹھے اور اپنی کتاب میں اسے ثبت کرنے کی غلطی کر گزرے۔“

(”صحیح بخاری کا مطالعہ“ : ۶۶/۱)

جواب : قارئین! شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کا عبید اللہ بن موسیٰ عسی پر یہ جرح نقل کرنا ان کی اصولِ حدیث اور علمِ رجال سے جہالت کی روشن دلیل ہے، کیونکہ:

(۱) عبید اللہ بن موسیٰ کو بہت سے محدثین نے ثقہ و معتبر قرار دیا ہے، جن کا ذکر میرٹھی

صاحب خیانت کرتے ہوئے ڈکار گئے ہیں۔ آئیے ملاحظہ فرمائیں:

① امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۸-۲۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ راوی تھے۔

(الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۳۳۴/۵، وسندہ صحیح)

② امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۵-۲۷۷ھ) ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

صدوق، کوفی، حسن الحديث، وأبو نعيم أتقن منه، وعبيد الله أثبتهم في إسرائيل، وهو ثقة.. ”یہ سچے آدمی تھے، کوفہ کے رہائشی تھے، ان کی حدیث (کم از کم) حسن ہوتی ہے۔ ابو نعیم ان سے پختہ تھے، لیکن اسرائیل سے بیان کرنے میں تو عبید اللہ سب سے بڑھ کر معتبر ہوتا ہے، وہ ثقہ راوی ہے۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۳۳۴/۵، وسندہ صحیح)

③ امام احمد بن عبد اللہ الحلی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۱-۲۶۱ھ) فرماتے ہیں: کوفی، ثقہ،

عالم بالقرآن، صدوق. ”وہ کوفہ کے رہنے والے، ثقہ تھے، قرآن کریم کے عالم اور سچے تھے۔“ (الثقات للحلی: ۱۴۴/۲)

④ امام ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۸-۲۳۰ھ) لکھتے ہیں: وکان ثقة، صدوقاً،

إن شاء الله... ”وہ ثقہ اور سچے تھے، إن شاء الله!“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: ۴۰۰/۶)

⑤ امام عمر بن احمد، ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ (۲۹۷-۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

صدوق، ثقة، وکان يضطرب فی حدیثه عن سفیان اضطراباً قبیحاً.

”وہ صدوق اور ثقہ تھے، البتہ سفیان (ثوری) کی احادیث میں سخت اضطراب میں پڑتے

تھے۔“ (تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین: ۱۶۵/۱)

⑥ امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (۳۵۴ھ) بھی ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ (الثقات: ۱۵۲/۷)

⑦، ⑧ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۴-۲۵۶ھ) اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۴-۲۶۱ھ) کا ان سے

روایات بیان کرنا ان دونوں کے نزدیک عبید اللہ بن موسیٰ کے ثقہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ انہوں نے صحت کی شرط کو ملحوظ رکھا ہے۔

⑨ امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ (۲۲۳-۳۱۱ھ) نے بھی اپنی کتاب میں صحت کی شرط لگائی ہے اور

عبید اللہ بن موسیٰ سے کثرت کے ساتھ روایات بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ان کے نزدیک بھی ثقہ ہیں۔

⑩ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (م ۳۰۷ھ) نے اپنی بھی کتاب المُنْتَخَبِ میں ان سے کئی ایک مقامات پر روایت لے کر ان کی توثیق کی ہے، کیونکہ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں صحت کی شرط رکھی ہے۔

تلك عشرة كاملة !

اس کے علاوہ امت مسلمہ کے تمام محدثین و ناقدین کا صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر اتفاق کرنا عبید اللہ بن موسیٰ العباسی کی ثقاہت پر زبردست دلیل ہے۔

پھر توثیق و جرح کے ان سب اقوال کو مدنظر رکھ کر ناقدِ رجال علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے عبید اللہ بن موسیٰ کو ثقہ اور بڑے بڑے علمائے حدیث میں سے ایک کہا ہے۔ (الکاشف للذہبی: ۳۵۹۳)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں سب اقوال کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں:

ثقة، كان يتشيع. ”ثقة تھے، شیعیت میں مبتلا تھے۔“ (تقریب التہذیب: ۴۳۴۵)

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ اتنے محدثین کی طرف سے عبید اللہ بن موسیٰ کے ثقہ ہونے کی صراحت کے بعد میرٹھی صاحب کی بات کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے؟ کیا کسی راوی کے بارے میں ناقدینِ رجال کی آراء کو علامہ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور باقی ساری امت مسلمہ بہتر سمجھتی ہے یا فنِ رجال سے یکسر جاہل منکرینِ حدیث؟ فیصلہ خود کریں!

(۲) محدثین کا عبید اللہ بن موسیٰ کو شیعہ کہنا کوئی جرح نہیں، کیونکہ متقدمین کی اصطلاح میں

”تشیع“ کا مطلب صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اعتقاد ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

التَّشِيعُ فِي عَرَفِ الْمُتَقَدِّمِينَ هُوَ اعْتِقَادُ تَفْضِيلِ عَلِيٍّ عَلَى عِثْمَانَ، وَأَنَّ عَلِيًّا كَانَ مَصِيْبًا فِي حُرُوبِهِ، وَأَنَّ مَخَالَفَهُ مَخْطِئٌ، مَعَ تَقْدِيمِ الشَّيْخَيْنِ وَتَفْضِيلِهِمَا، وَرَبَّمَا اعْتَقَدَ بَعْضُهُمْ أَنَّ عَلِيًّا أَفْضَلَ الْخَلْقِ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِذَا كَانَ مُعْتَقِدُ ذَلِكَ وَرَعًا، دَيِّنًا، صَادِقًا، مُجْتَهِدًا، فَلَا تَرَدُّ رَوَايَتُهُ بِهَذَا، لَا سِيَّمَا إِنْ كَانَ غَيْرَ دَاعِيَةٍ.

عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا قائل ہونے کے ساتھ ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دینا ہے، نیز یہ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں حق پر تھے اور آپ کے مخالفین غلطی پر تھے۔ ان (متقدمین کی اصطلاح میں شیعہ لوگوں) میں سے کوئی (تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کا احترام کرنے کے ساتھ

ساتھ) بسا اوقات یہ بھی عقیدہ بھی رکھ لیتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول کریم ﷺ کے بعد سب مخلوق سے افضل ہیں۔ جب اس اعتقاد والا آدمی پر ہیزگار، دین دار، سچا اور مجتہد ہو تو اس کی روایت کو رد نہیں کیا جائے گا۔“ (تہذیب التہذیب لابن حجر: ۸۱/۱)

معلوم ہوا کہ متقدمین دشمن صحابہ کو شیعہ نہیں کہتے تھے، بلکہ رافضی کہتے تھے، لہذا جب راوی سچا ہو تو شیعہ ہونا اس کی روایت میں کوئی جرح نہیں۔ اب ہر منصف مزاج آدمی خود ہی اندازہ لگا لے کہ بھلا میرٹھی صاحب جیسے شخص کا عبید اللہ بن موسیٰ پر یہ اعتراض کرنا اور اس وجہ سے صحیح بخاری کی صحت کو مشکوک سمجھنا کہاں کا انصاف ہے؟

(۳) رہا میرٹھی صاحب کا ابواسحاق جوزجانی کی عبید اللہ بن موسیٰ پر جرح نقل کرنا تو یہ بھی ان کے اقوالِ محدثین اور علم رجال کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اولاً تو قریباً ایک درجن کے قریب محدثین کی توثیق کے مقابلے میں ابواسحاق جوزجانی کی جرح کچھ حیثیت نہیں رکھتی، ثانیاً یہ جرح اصولاً بھی مردود ہے۔

اگر میرٹھی صاحب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی درج ذیل عبارت ہی پڑھ لیتے تو ان کی تسلی ہو جاتی اور وہ اتنی بڑی جہالت کا منہ نہ دیکھتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جن لوگوں کے جرح والے قول کو قبول کرنے میں توقف کرنا ضروری ہے، ان میں سے وہ شخص بھی ہے، جس کی مجروح راوی سے بسبب اختلاف عقیدہ عداوت ہو، چنانچہ جب کوئی ماہر (رجال) آدمی ابواسحاق جوزجانی کی اہل کوفہ کے خلاف جرح پر غور کرے گا، وہ عجیب طرز دیکھے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقیدہ نصب (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عداوت) میں سخت انحراف کا شکار ہیں، جبکہ کوفہ والے تشیع (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت) میں مشہور ہیں، لہذا آپ دیکھیں گے کہ اہل کوفہ میں سے جس کو بھی ابواسحاق جوزجانی نے ذکر کیا ہے، اس پر تیز زبان اور سخت عبارت کے ساتھ جرح کرنے میں توقف نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ امام اعمش، ابو نعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ (عبسی)، جیسے حدیث کے پائیوں اور روایت کے ستونوں پر بھی جرح کرنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب جوزجانی کے مقابلے میں جب ان کا ہم پلہ امام یا ان سے بڑا امام اس آدمی کو ثقہ کہہ دے، جس کو جوزجانی کے ضعیف کہا ہو تو توثیق کو قبول کیا جائے گا۔۔۔“

اسی طرح امام یعقوب بن سفیان الفسوی کا عبید اللہ بن موسیٰ کو رافضی کہنا (المعرفة والتاریخ: ۲۰۹/۳) ان کی غلط فہمی ہے اور جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے، نیز اس وجہ سے بھی قابل التفات نہیں کہ رافضی لوگ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، خصوصاً شیخین، یعنی سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کو بہت برا بھلا کہتے ہیں، جبکہ عبید اللہ بن موسیٰ سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک بہت ہی زبردست قول مروی ہے۔

امام ابوبکر الشافعی، جن کے بارے میں مشہور ناقد رجال امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جبل ، ثقة ، مأمون ، ما كان في ذلك الزمان أوثق منه .

”یہ (حافظے اور ضبط) کے پہاڑ تھے، ثقہ و مامون تھے، اس دور میں ان سے بڑھ کر ثقہ کوئی نہ

تھا۔“ (سوالات حمزة بن يوسف السهمي: ۴۰۳)

یہ جبل الحفظ والعلم امام ابوبکر الشافعی رحمہ اللہ اپنی غیلانیات میں اس قول کو یوں باسند بیان کرتے ہیں:

حدَّثنا محمد بن سليمان بن الحارث الواسطيّ ، ثنا عبید اللہ بن موسیٰ العباسیّ ، ثنا مالک بن مغول عن عون بن أبي جحيفة عن أبيه ، قال : قال عليّ : خيرنا بعد نبينا أبو بكر وعمر .

”ہمیں محمد بن سلیمان بن حارث واسطی (ثقة ، انظر: سير

اعلام النبلاء: ۳۸۷/۱۳) نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں، ہمیں عبید اللہ بن موسیٰ عباسی نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں، ہمیں مالک بن مغول (ثقة ، ثبت ، حجة) نے حدیث بیان کی، وہ عون بن ابی جحیفہ (ثقة) سے حدیث بیان کرتے ہیں، وہ اپنے والد (صحابی رسول سیدنا ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم میں سے سب سے بہتر سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔“

(کتاب الفوائد (الغیلانیات) لابی بکر الشافعی: ۱۱۴/۱، رقم: ۷۱، وسنده صحیح کما تری)

اب بھی کوئی منکر حدیث اگر عبید اللہ بن موسیٰ کو رافضی کہہ کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی جسارت کرے تو اس نا عاقبت اندیش کی اپنی ہی بدبختی ہے!

اب تو قارئین کرام کو یقین ہو جانا چاہیے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول میرٹھی صاحب فن رجال میں ماہر نہیں ہیں، ورنہ انہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے تھی کہ عبید اللہ بن موسیٰ کوئی ہیں اور سیدنا



علیؑ کی زیادہ محبت کی وجہ سے جو زبانی نے ان پر جرح کی ہے، کیونکہ یہ ناصبی (سیدنا علیؑ سے نفرت کرنے والے) تھے۔ اور یعقوب بن سفیان کی جرح ان کی غلط فہمی ہے۔

(۴) پھر اگر اصولاً اس جرح کے مقابلے میں کوئی ایک بھی امام عبید اللہ بن موسیٰ کو ثقہ کہہ دیتا تو اس کی بات قبول کی جانی ضروری تھی، ہم نے تو قریباً ایک درجن محدثین و نقادِ رجال کے اقوال سے موسیٰ بن عبید اللہ کی توثیق ثابت کر دی ہے۔ کیا اب بھی کوئی شخص میرٹھی صاحب کو صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح احادیث پر اعتراضات کرنے کے قابل سمجھتا ہے؟

(۵) مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہماری بیان کی ہوئی صراحتِ محدثین کے مطابق عبید اللہ ابن موسیٰ اپنے شیخ اسرائیل بن یونس سے بیان کرنے میں سب سے پختہ کار و معتبر ہے اور صحیح بخاری کی اس حدیث میں بھی عبید اللہ اپنے اسی شیخ اسرائیل بن یونس سے ہی بیان کر رہا ہے، لیکن میرٹھی صاحب نے اپنی علمی بے مائیگی کی بنا پر اس حدیث پر اعتراض کر کے اپنی جہالت پر مہر ثبت کر دی ہے۔

(۶) رہا امام ساجی کا ان کے بارے میں یہ کہنا کہ: **كان يفرط في التشيع** .

”یہ تشیع میں بڑھے ہوئے تھے۔“ (تہذیب التہذیب : ۷/۴۷)

❀ اولاً تو اس کی کوئی سند ہمیں نہیں مل سکی، جس سے معلوم ہو کہ حافظ ابن حجرؒ کو امام ساجی کا یہ قول کس ذریعے سے پہنچا تھا؟

❀ ثانیاً ان الفاظ سے پہلے امام ساجی کا عبید اللہ بن موسیٰ کو ”صدوق“ کہنا خود میرٹھی صاحب نقل کر چکے ہیں، لہذا اگر امام ساجی سے یہ قول ثابت ہو بھی جائے تو ان کے نزدیک تشیع میں بڑھنے سے مراد رافضی ہونا اور حدیث میں غیر معتبر ہو جانا قطعاً نہیں ہو سکتا۔

متقدمین محدثین کے نزدیک بھی شیعیت میں غلو سے مراد رافضیت نہیں ہوتی، لہذا میرٹھی صاحب کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ غالی شیعہ رافضی ہوتا ہے، بلکہ جب متقدمین کسی راوی کے بارے میں غالی شیعہ کے الفاظ استعمال کریں تو اس سے مراد سیدنا علیؑ کی شان میں غلو کرتے ہوئے ان کا مقام و مرتبہ سیدنا ابوبکر و عمرؓ سے بڑھانا اور سیدنا علیؑ کے مخالفین کو غلطی پر قرار دینا ہوتا ہے، جیسا کہ حافظ ذہبیؒ نے اس کی صراحت کی ہوئی ہے۔ (میزان الاعتدال للذہبی : ۵/۱-۶)

کاش کہ میرٹھی صاحب اصولِ حدیث کا کچھ علم حاصل کر لیتے!

(۷) امام احمد رحمہ اللہ کا اس کے غالی شیعہ، ”یعنی رافضی“ ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دینا بھی باسند ثابت نہیں ہو سکا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس بات کا اظہار کہاں کیا ہے؟ منکر بن حدیث اس کی سند تلاش کر کے بتائیں، پھر ہم اس کا جواب اصول حدیث کے مطابق یہ دے دیں گے کہ تشیع کوئی جرح نہیں ہے۔ نیز ہم یہ بھی کہیں گے کہ اس غیر ثابت جرح کے خلاف امام احمد رحمہ اللہ سے یہ قول بالکل صحیح ثابت ہے کہ :

رَبِّمَا أَخْرَجْتَ عَنْهُ ، وَرَبِّمَا ضَرَبْتَ عَلَيْهِ ، حَدَّثَ عَنْ قَوْمٍ غَيْرِ ثِقَاتٍ ، فَإِنْ كَانَ مِنْ حَدِيثِ الْأَعْمَشِ فَعَلَى ذَلِكَ . ”میں نے کبھی ان کی حدیث بیان کی ہے اور کبھی چھوڑ دی ہے۔ انہوں نے غیر معتبر لوگوں سے احادیث بیان کی ہے۔ اگر أعمش سے اس کی حدیث ہو تو وہ اسی طرح (منکر) ہوگی۔“ (سوالات المروزی : ۳۰۹)

معلوم ہوا کہ امام احمد رحمہ اللہ بھی عبید اللہ بن موسیٰ کو ”ضعیف“ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے شیوخ کی وجہ سے ان کی روایات چھوڑتے تھے، اسی لیے ان کی وہ روایات لے لیتے تھے، جو انہوں نے ثقہ راویوں سے بیان کی ہوتی تھیں۔

رہا میرٹھی صاحب کا اپنا خبث باطن کا اظہار کرتے ہوئے یہ الفاظ ”یعنی رافضی“ بڑھانا تو اس کا رد ہماری بیان کردہ اس روایت سے بخوبی ہو جائے گا، جس میں عبید اللہ بن موسیٰ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول روایت کر رہے ہیں۔

نیز ہم گذشتہ سطروں میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اصول حدیث کے مطابق بھی متقدمین کی طرف سے غالی شیعہ کا معنی رافضی نہیں ہو سکتا۔ یہ سراسر جہالت پر مبنی بات ہے۔

یہ ہے میرٹھی صاحب کی اپنی علمی و مطالعاتی قابلیت اور وہ اعتراض کرتے ہیں امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی اس کتاب پر جسے پوری امت نے اتفاق کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

ع ایہہ گستاخ اکھیاں کتھے جاڑیاں !

صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی پاداش میں اتنی سبکی اور شرمندگی اٹھانے کے بعد منکر بن حدیث کو چاہیے کہ اب ہی تائب ہو جائیں اور آئندہ ایسی جسارت سے قیامت تک کے لیے سچی اور پکی توبہ کر لیں۔ اگر وہ اس سے باز نہ آئیں گے تو محدثین کے حقیقی وارث اہل الحدیث ان کی تلپیوں، عیاریوں، غلطیوں اور جہالتوں کو آشکار کرتے رہیں گے۔

إِنْ شَاءَ اللَّهُ !

غلام مصطفیٰ ظہیر اسمن پوری

وفات النبی ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

صحابی رسول سیدنا سالم بن عبید الاشجعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ کے مرض میں آپ ﷺ پر غشی طاری ہوئی، پھر افاقہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے؟ عرض کی گئی، جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا، بلال کو حکم دو کہ وہ اذان کہیں اور ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی، میرے والد تو نہایت نرم دل آدمی ہیں۔ جب وہ اس جگہ (مصلیٰ رسول) پر کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے اور نماز نہ پڑھاسکیں گے، اگر آپ کسی اور کو حکم دیں تو اچھا ہوگا۔ آپ ﷺ پر پھر غشی طاری ہوئی، پھر افاقہ ہوا تو فرمایا، بلال کو حکم دو کہ وہ اذان کہیں اور ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، تم تو یوسف والیاں ہو۔ پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا، انہوں نے اذان کہی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا، انہوں نے نماز پڑھائی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے کچھ سکون محسوس کیا تو فرمایا، میرے سہارا لینے (اور مسجد جانے) کے لیے کسی کو دیکھو۔ بریرہ اور ایک آدمی آئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کا سہارا لیا (اور مسجد میں آ گئے)، جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو (مصلیٰ امامت سے) پیچھے ہٹنے لگے، آپ ﷺ نے ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ اپنی جگہ میں رہیں، یہاں تک کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پوری کر لی۔ پھر رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اللہ کی قسم! میں کسی کو یہ کہتے نہیں سنوں گا کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہیں، مگر اپنی اس تلوار سے قتل کر دوں گا اور کہا، لوگ ان پڑھتے تھے، ان میں آپ ﷺ سے پہلے کوئی نبی نہیں تھا (جہالت ابھی باقی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کیسے فوت ہو سکتے ہیں؟)۔ لوگ سہم گئے اور انہوں نے کہا، اے سالم! تم رسول اللہ ﷺ کے ساتھی (سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے پاس جاؤ اور ان کو بلاؤ۔ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، آپ رضی اللہ عنہ اپنی مسجد میں تھے، میں آپ رضی اللہ عنہ کے پاس روتے ہوئے اور دہشت زدہ گیا۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھا تو پوچھنے لگے، کیا رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں؟ میں نے کہا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں کہ میں کسی کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنوں گا، مگر اپنی اس تلوار سے اسے قتل کر دوں گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا، چلو۔ میں آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلا۔ آپ رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو لوگ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لوگو! مجھے راستہ دو! لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو راستہ دے دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ آئے کر رسول اللہ ﷺ پر جھک گئے اور آپ رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا، پھر قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ (الزمر: ۳۹/۳۰) (اے نبی! یقیناً آپ فوت ہونے



والے ہیں اور وہ کافر بھی فوت ہونے والے ہیں، پھر لوگوں نے کہا، اے اللہ کے رسول کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! لوگوں نے یقین کر لیا کہ آپ ﷺ سچ کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا، اے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ کا جنازہ پڑھا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! انہوں نے کہا، کیسے؟ فرمایا، کچھ لوگ (حجرہ عائشہ میں) داخل ہوں گے اور اللہ اکبر کہیں گے، درود و سلام پڑھیں گے اور دعا کریں گے، پھر وہ نکل آئیں گے، پھر کچھ لوگ داخل ہوں گے اور اللہ اکبر کہیں گے، درود و سلام پڑھیں گے اور دعا کر کے نکل آئیں گے، یہاں تک کہ (تمام) لوگ داخل ہو جائیں گے۔ لوگوں نے کہا، اے اللہ کے رسول کے ساتھی؟ کیا رسول اللہ ﷺ کو دفن کیا جائے گا؟ فرمایا، ہاں! انہوں نے کہا، کہاں؟ فرمایا، اسی جگہ میں، جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح عمدہ جگہ میں ہی قبض فرمائی ہے۔ انہوں نے جان لیا کہ آپ ﷺ نے سچ فرمایا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ آپ ﷺ کو آپ کے خاندان والے غسل دیں۔ مہاجرین مشورہ کے لیے جمع ہوئے، انہوں نے کہا، آپ ہمارے ساتھ ہمارے انصاری بھائیوں کی طرف چلیں تاکہ ہم ان کو بھی اس معاملے میں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ انصاری نے کہا، ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہوگا۔ اس پر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کس کے لیے ان تین فضائل جیسی کوئی فضیلت ہے؟ اس جیسی مقبوت کس کے لیے ہے؟ ﴿ثَانِي اَثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ۴۰/۹)، (آپ ﷺ دو میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب آپ ﷺ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے)، وہ دونوں کون ہیں؟ پھر آپ نے ہاتھ بڑھایا اور بیعت کی اور سب لوگوں نے اچھی اور خوبصورت بیعت کی۔ (الشمائل للترمذی: ۳۹۶، مسند عبد بن حمید: ۳۶۵، السنن الکبریٰ (کتاب الوفاة) للنسائی: ۴۲،

المعجم الکبیر للطبرانی: ۶۵/۷، دلائل النبوة للبيهقي: ۲۹۹/۷، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۱۵۳۱ھ/۱۲۲۳ھ) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

حافظ بیہقی لکھتے ہیں: ”رجالہ ثقات۔“ (اس کے راوی ثقہ ہیں۔) (مجمع الزوائد: ۱۸۳/۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”إسناده صحيح، لكنّه موقوف۔“

”اس روایت کی سند صحیح ہے، لیکن یہ قول صحابی ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۵۲۹/۱)

بوصیری کہتے ہیں: ”هذا إسناده صحيح، رجاله ثقات۔“ ”یہ سند صحیح ہے اور اس کے

راوی ثقہ ہیں۔“ (مصباح الزجاجة: ۱/۴۶، ح: ۱۲۳۴)